ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 15)
ٹیڑھی اینٹ
(تحریر حسام بٹ)
عقیل قریشی - یاسر حسین
ناصر بلوچ - صائم بھائی
محمد سجاد بھٹی
سسپنس ڈائجسٹ : جون 2005

ٹیڑھی اینٹ

ملک صفدر حیات

ظالم کا نشانہ کوئی بھی بنے ہر حساس دل اس کا اثر اپنے دل پر ضرور محسوس کرتا ہے اور ظلم کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش بھی ضرور کرتا ہے۔ اسی ظلم و ستم کی کوکھ سے جنم لینے والے سانحے کا خونچکاں ماجرا۔ ایسے کردار اب بھی ہمارے ارد گرد سانس لے رہے ہیں۔

ظالم کے خلاف سینہ سپر ہوکر کچھ کر گزرنے والوں کی کتھا ملک صاحب کی ڈائری سے سچی کہانی

مرغی انڈا دینا بند کردے تو مالک کی نظر کا خار بن جاتی ہے۔ اس کا دانہ پانی دیکھ دیکھ ایک بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ مالک کی بے اعتنائی اور بیزاری کو دیکھتے ہوئے دڑبے کی دوسری مرغیاں بھی اس سے امتیازی سلوک پر اتر آتی ہیں۔ مالک کی "شہ" پر وہ سب مل کر اس کی وہ گت بناتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہونے لگتی ہے۔ پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ چھری اور اس کی گردن کے بیچ فاصلہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

عابدہ بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دو چار تھی!

کریم نے دھمکی دینے والے انداز میں کہہ دیا تھا "بس مجھے بچہ چاہیے اور وہ بھی ایک سال کے اندر۔ تمہارے پاس صرف ایک سال کی مہلت ہے۔ اگر تم نے بیٹے کو جنم نہ دیا تو میری طرف سے چھٹی سمجھنا۔ میں تین لفظ بولنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کروں گا۔"

یہی عابدہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی "تھانے دار صاحب! اس نے فریادی لہجے میں کہا "آپ ہی بتائیں میرا قصور کیا ہے۔ میں نے کریم کے گیارہ بچوں کو جنم دیا ہے۔ چھ لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ اب اگر پچھلے دو تین سال سے یہ سلسلہ رک گیا ہے تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔ وہ ہر رات میری ہڈیوں کا سرمہ بناتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے ایک لڑکا اور چاہیے' پوری درجن ہوجائے گی تو میں لوگوں کے سامنے فخر سے اپنی مونچھ اونچی کر کے چلوں گا......اور مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کیے اور روہانسی آواز میں سلسلہ فریاد کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تھانے دار جی! گیارہ اولادیں پیدا کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ آپ ماشاءاللہ سمجھ دار ہیں ان معاملات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں کریم کا لات جوتا کھا کر اس کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے اس سے پورا پورا تعاون کرتی ہوں مگر شاید قدرت ہی کو منظور نہیں کہ میں کوئی اور بچہ پیدا کرسکوں!"

عابدہ نے بڑے مایوسانہ انداز میں بات ختم کی تو میں نے کہا "اگر قدرت کو منظور نہیں تو اس میں بھی تم لوگوں ہی کی کوئی بھلائی پوشیدہ ہوگی۔ گیارہ بچے ایک بہت بڑی تعداد ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے عابدہ سے پوچھ لیا "ویسے تمہارا خاوند کرتا کیا ہے؟"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے فوراً وضاحت کردی "کریم کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟"

دراصل میں یہ جاننا چاہتا تھا' کریم کے پاس گیارہ بچوں کو پالنے کا کیا بندوبست ہے جو وہ بارہویں کے لیے اتنا بے چین ہے۔ یہ ٹھیک ہے جو اولاد دیتا ہے' وہ بچے کے ساتھ ہی اس کا رزق بھی اتارتا ہے لیکن اس رزق کو تلاش کرنے کی ذمے داری تو بہرحال بچے کے والدین ہی کی ہوتی ہے۔

عابدہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا' کریم سائیکلوں کا مستری ہے جی۔ ادھر لاری اڈے پر اس کی "کریم سائیکل ورکس" کے نام سے دکان ہے۔ سائیکلوں کی مرمت کے ساتھ ساتھ وہ کرائے پر سائیکلیں بھی دیتا ہے۔"

مجھے کریم پر بہت غصہ آیا۔ میں نے عابدہ سے پوچھا "کیا اس کی اتنی آمدنی ہوجاتی ہے کہ تیرہ افراد آرام سے زندگی گزار سکیں؟"

"بس جی' گھر کا چولہا ایک دن بھی نہیں بجھا!" وہ بے چارگی سے بولی۔

میں نے کہا "صرف چولہا جلنے سے ہی زندگی نہیں گزرتی۔ انسان کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ہمیں اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ زندگی کے اور بھی تقاضے ہوتے ہیں۔"

"انسان' اونہہ!" اس نے یہ دو الفاظ بڑے کرب ناک انداز میں ادا کیے تھے "تھانے دار جی! میری اولادیں تو کتے

بلبلوں کی طرح پل رہی ہیں۔ ان کی حالت دیکھتی ہوں تو دل خون ہو جاتا ہے' چھپ چھپ کر روتی ہوں لیکن ان کی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں بھی کیا کروں جی۔'' ایک مرتبہ پھر اس کے آنسو جاری ہو گئے ''وہ جیسے بھی ہیں میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا تو نہیں گھونٹ سکتی نا!''

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''یہ تو کریم کی ذمے داری ہے۔''

وہ گلوگیر آواز میں بولی ''اس نے تو مجھے دھمکی دے دی ہے۔ اگر میں نے ایک سال کے اندر اندر اس کے لیے لڑکا پیدا نہ کیا تو پتا نہیں میرا کیا حشر ہوگا۔ طلاق کا ڈراوا تو وہ دے ہی چکا ہے۔ میں اس عمر میں کہاں جاؤں گی۔ دنیا میں میرا تو کوئی ہے بھی نہیں۔''

''جس کا کوئی نہیں ہوتا' اس کا خدا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی ''تم فکر نہ کرو۔ میں کریم کو تھانے بلا کر اس سے بات کروں گا ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے جی سب ٹھیک ہو جائے۔'' وہ دل شکستگی سے بولی۔

میں نے تسلی دلاسا دے کر عابدہ کو رخصت کر دیا۔

عابدہ کی عمر لگ بھگ چھتیس سال رہی ہو گی۔ اس کی صحت کا ذکر کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جو عورت گیارہ بچے پیدا کر چکی ہو اس کی صحت اور حالت زار کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے حلیے اور صورت شکل سے پینتالیس پچاس کی نظر آتی تھی۔

عابدہ کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے اس کے گھریلو حالات کے بارے میں چند سوالات بھی کیے تھے جس کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا' اس کی شادی اٹھارہ انیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس وقت کریم بائیس تئیس سال کا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ان کے ہاں بچوں کی لائن لگ گئی۔ پہلے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اوپر تلے چھ لڑکیاں تولد ہوئیں جن کی عمریں اس وقت آٹھ سے پندرہ سال کے درمیان تھیں۔ بڑے دو بیٹوں میں فاروق سولہ سال کا اور یوسف سترہ سال کا تھا۔ چھ لڑکیوں کے بعد پھر تین لڑکے ہوئے جن کی عمریں علی الترتیب سات' پانچ اور تین سال تھیں۔ تین سالہ کامران کے بعد پیدائش کا سلسلہ رک گیا...... اور یہی بات مستری کریم کو پسند نہیں آئی تھی!

گاؤں دیہات اور چھوٹے قصبے جات کے اپنے مخصوص مسائل ہوتے ہیں' رسم و روایت بھی شہروں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ وہ لوگ تھانے اور تھانے دار کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اور بعض اوقات اپنے انتہائی نجی معاملات کو بھی ''تھانے'' کے تعاون سے حل کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ عابدہ اپنے خاوند کی نامعقول دھمکی سے گھبرا کر فوراً میرے پاس چلی آئی تھی۔ اس نوعیت کی حرکات کو آپ سادہ لوح افراد کی معصومیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال ہمارے زمانے میں تھانے کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ لوگ پولیس والوں کا بڑا احترام کرتے تھے اور اپنے دکھوں کے مداوے کے لیے ہمارا دروازہ ضرور کھٹکھٹاتے تھے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر عابدہ نے تھانے سے جاتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس کے شوہر کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ بیوی نے اس کے خلاف کوئی شکایت ''درج'' کروائی ہے۔ مجھے یہ وعدہ کرتے ہوئے عابدہ کی حالت پر بہت ترس آیا تھا۔ جس عورت نے اپنے شوہر کے بچے پیدا کر کر کے خود کو ختم کر لیا ہو اس شوہر کو تو ایسی عورت کے ہر دکھ تکلیف کا خیال رکھنا چاہیے کجا یہ کہ وہ بدنصیب کسی وحشت زدہ ہرنی کے مانند سہمی ہوئی تھی۔

میں نے اسی روز شام کے وقت ایک کانسٹیبل کو لاری اڈے بھیج کر کریم مستری کو تھانے بلا لیا۔

کریم چالیس سال کا ایک گول مٹول اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے کام والے کپڑے پہن رکھے تھے جن پر جا بہ جا تیل اور گریس کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔ وہ اس بلاوے پر حیران سے زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ کانسٹیبل اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تو میں نے سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کریم! پتا ہے میں نے تمہیں تھانے کیوں بلایا ہے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ''نہیں جناب میں نے تو کوئی ایسا ویسا جرم بھی نہیں کیا!''

''ایسا ویسا نہ سہی مگر تم نے جیسا تیسا جرم ضرور کیا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''اور میں نے تمہارا انٹرویو کرنے کے لیے بلایا ہے۔''

''انٹرویو!'' وہ بھونچکا نظر سے مجھے دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے اس کے استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''کریم! تمہارے بچے کتنے ہیں؟''

''گیارہ جناب!'' اس نے بتایا تاہم اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں نے یہ سوال کیوں کیا ہے ''آپ میرے بچوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اوئے نامعقول! کیا تمہیں اتنا بھی پتا نہیں' انٹرویو میں سوالات ہی کیے جاتے ہیں۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا ''تمہاری کسی بھی چیز کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے...... اور

ہاں اب بیچ میں کوئی اعتراض نہ اٹھانا ورنہ میں تمہیں کریم رول یا آئس کریم ضرور بنادوں گا۔ ویسے اپنے قد کاٹھ اور جسامت سے تم کسی بیوٹی کریم کی بنی بنائی شیشی ہو۔ مجھے تم پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی!''

پستہ قامتی کے ساتھ ہی وہ مائل بہ فربہی بھی تھا۔ اگر قد قامت اچھی ہوتی تو اس کی فربہی چھپ جاتی لیکن پانچ فٹ دو انچ نے اس اوسط مٹاپے کو زیادہ نمایاں کردیا تھا۔ میں نے اسے ایک مناسب ڈانٹ پلائی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ''تم نے شادیاں کتنی کی ہیں؟''

اس زمانے میں عموماً دو تین شادیاں کرلی جاتی تھیں اور خانگی سطح پر زیادہ بگاڑ بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اکثر گھروں میں تو دو یا تین اور بعض اوقات چاروں کی چاروں بیویاں ایک ہی چھت تلے زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ شاید اس لیے بھی ممکن تھا کہ اس وقت معاشی مسائل نے انسان کے لیے کسی عفریت کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ایک عام انسان اسے بلی کتا سمجھ کر ہشکار دیتا تھا مگر آج کل صورت حال قطعی مختلف ہے۔ دلوں اور جیبوں میں اتنی گنجائش نہیں رہی کہ کوئی مرد دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ ایک ہی اگر ''عزت'' سے نبھ جائے تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جاتا ہے۔ انسان بڑے زور و شور سے ترقی کا دعوے دار ہے۔ اگر یہی ترقی ہے تو پھر یہ بڑی معکوس ہے! ترقی تو وہ ہے جو مسائل کو ختم کرکے زندگی کو آسان بنائے۔

کریم میرے سوال پر تھوڑا چونکا اور بولا ''صرف ایک جناب!''

اس کے بارے میں عابدہ سے مجھے تمام معلومات حاصل ہو چکی تھیں تاہم میں اس سے محض چھیڑ چھاڑ کررہا تھا تاکہ اصل موضوع پر لتاڑ پھٹکار کے لیے اسے تیار کیا جاسکے۔ میں نے قدرے حیرت بھرے لہجے میں کہا ''میں تو سمجھ رہا تھا اتنی اولادیں دو تین بیویوں میں سے ہوں گی!''

''میں اتنا خوش قسمت کہاں تھانے دار صاحب!'' اس نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔

میں نے اس کی دھلائی شروع کردی ''اگر تم خوش قسمت نہیں ہو تو اپنی اولاد کی قسمت کا کباڑا کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟''

''میں نے کیا کیا ہے جناب!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے تلخ لہجے میں کہا ''تم گیارہ زندگیوں کو اس دنیا میں لائے ہو اور بارہویں زندگی کو لانے کی کوشش میں ہو اور اس طرح کوشش میں ہو کہ اگر اس مرتبہ تمہاری بیوی نے لڑکا پیدا نہ کیا تو تم اسے طلاق دے دو گے!''

وہ ہکابکا مجھے تکے چلا گیا۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''یہ نامعقول خیالات تم اس عورت کے لیے رکھتے ہو جس نے اپنی ساری زندگی تمہیں اور تمہاری اولاد کو دے دی۔ کیا اس دیرینہ رفیق کی خدمت اور محبت کا یہی صلہ ہے؟''

''یہ..... یہ طلاق والی بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟'' وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا ''کیا عابدہ نے کوئی شکایت کی ہے۔''

میں نے برہمی سے کہا ''اس بے چاری نے آج تک تم سے کوئی شکایت کی ہے جو وہ مجھ سے آکر کچھ کہتی۔ میں نے تو اڑتے اڑتے تمہارے بارے میں سنا ہے اور کیا تمہیں پتا نہیں، میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ ایک ایک گھر کی خبر رہتی ہے مجھے۔ تھانے داری کوئی ابا جی کا کاروبار نہیں!''

''وہ جی..... وہ جی.....'' وہ ہکلایا۔ میرے انداز نے اسے بوکھلا دیا تھا ''میں تو صرف یہی چاہ رہا تھا' ذرا توازن قائم ہوجائے۔ دیکھیں نا جی جب چھ بچیاں ہیں تو بچے بھی چھ ہی ہونا چاہیے۔''

بچے اور بچیوں سے اس کی مراد لڑکے اور لڑکیاں تھی۔ میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا ''تم کیا گھر کے اندر میزان لیے بیٹھے رہتے ہو۔ تم کون ہوتے ہو یہ ناپ تول کرنے والے۔ جو اس دنیا میں آچکے ہیں ان کی بہتری کے لیے سوچو اور خواہ مخواہ گھر والی کو ہراساں نہ کرو۔ اگر اب مجھے پتا چلا کہ تم نے عابدہ کو تنگ کیا ہے یا اسے طلاق کی دھمکی دے رہے ہو تو میں ایک لمحے کا آسرا نہیں کروں گا۔ تم میرے تھانے کی حوالات میں نظر آؤ گے۔ سمجھ گئے؟''

پتا نہیں وہ میری بات کو سمجھا یا نہیں تاہم اس نے اپنی گردن کو اتنی صحت مند اثباتی جنبش دی جیسے میری نصیحت اس کی سمجھ کی تہ میں اتر گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے رخصت کردیا۔

آئندہ چند روز تک امن و امان کی صورت حال رہی۔ عابدہ نے کسی قسم کی کوئی شکایت کی اور نہ ہی کریم کی کسی اور زیادتی کی خبر ملی۔ میں یہی سمجھا کہ کریم کو عقل آگئی ہے اور اس نے میری نصیحت پا کر اپنی زندگی کی ساتھی کو ایک انسان تسلیم کرلیا ہے۔ یہ نتائج خوش آیند تھے لہٰذا میں مطمئن ہوگیا۔ کچھ دن بعد میں عابدہ اور کریم کو بھول گیا۔ تھانے میں جس قسم کے

خطرناک اور سنسنی خیز معاملات جاری رہتے ہیں ان میں یہ معمولی سا گھریلو تنازع کیا اہمیت رکھتا تھا!

میں نے شروع میں جس معاملے کو معمولی تنازع سمجھ لیا تھا وہ بعد میں ایک بہت بڑا بکھیڑا بن کر سامنے آیا۔ عابدہ کی شکایت کے کوئی ایک ماہ بعد وہ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے یوسف کے ساتھ میرے پاس آئے۔ مجھے جب ان کی آمد کا پتا چلا تو میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ تینوں اس وقت سخت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا پھر کریم کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''کیوں بھئی! تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

کریم کے بجائے عابدہ بول اٹھی ''تھانے دار جی! ہم کل سے بہت پریشان ہیں۔''

''وہ تو تمہاری شکلوں ہی سے نظر آ رہا ہے۔'' میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا پھر عابدہ پر نگاہ جما دی ''کیا پریشانی ہے تم لوگوں کو؟''

''فاروق کہیں چلا گیا ہے۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

فاروق ان کے دوسرے نمبر والے بیٹے کا نام تھا۔ وہ یوسف سے چھوٹا تھا اور کسی کام کاج کا نہیں تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ دن بھر آوارہ گردی میں مصروف رہتا تھا۔ صبح کا نکلا رات گئے ہی گھر لوٹتا جب کہ یوسف قدرے مختلف مزاج کا لڑکا تھا۔ وہ دن بھر دکان میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ فاروق کی عمر سولہ سال تھی۔ وہ یوسف سے صرف ایک سال چھوٹا تھا۔

میں نے عابدہ سے پوچھا ''وہ آوارہ گرد کہاں چلا گیا ہے؟''

''اگر ہمیں پتا ہوتا تو پھر پریشانی کس بات کی تھی؟'' کریم نے کہا ''وہ کل رات سے گھر نہیں آیا اور آج کی رات بھی گزر گئی۔''

منتشر الذہنی کے باعث وہ اپنی بات کی وضاحت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس کا بیٹا فاروق چار مئی صبح کا گھر سے نکلا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا اور آج چھ مئی تھی۔

میں نے کریم سے پوچھا۔

''کیا وہ اس سے پہلے بھی کبھی اس طرح بتائے بغیر غائب ہوا ہے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ''یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے ورنہ چاہے دیر ہی سے سہی وہ رات کو گھر واپس آ جاتا ہے۔''

''تم نے اس کے یار دوستوں سے پوچھا؟''

''جی، کل کا پورا دن ہم فاروق کو تلاش کرتے رہے ہیں۔'' کریم نے بتایا ''ہر طرف دیکھ لیا مگر اس کا سراغ نہیں ملا۔ لگتا ہے وہ اس علاقے ہی میں نہیں ہے۔''

''تم ان لڑکوں کے نام تو جانتے ہوگے جن کے ساتھ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا؟''

کریم نے فرید، سلطان اور مطلوب کے نام گنوائے اور بولا ''اس کا زیادہ میل جول انہی لڑکوں سے تھا۔ میں نے سب کو چیک کر لیا ہے اور ان تمام کے گھر والوں سے بھی پوچھ پرتیت کر لی ہے لیکن فاروق کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔''

''ہوں! تم نے انہیں چیک کر لیا، میں بھی کروں گا۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''تمہارے قریبی رشتے دار کہاں کہاں رہتے ہیں؟''

''ہمارے زیادہ رشتے دار نہیں ہیں۔'' کریم نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ''فاروق کی ایک پھوپی لاہور میں رہتی ہے۔ ادھر سمن آباد میں میرے بہنوئی فضل محمود کی فروٹ کی دکان ہے۔''

''ہوسکتا ہے فاروق لاہور کی طرف نکل گیا ہو۔'' میں نے ایک امکان کی طرف اشارہ کیا۔

''آج تک ایسا ہوا تو نہیں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''جو کبھی نہ ہوا ہو وہ ہو بھی تو سکتا ہے۔ بہر حال تم لوگ لاہور والوں سے رابطہ کر کے فاروق کے بارے میں پوچھو میں یہاں اور آس پاس اسے تلاش کرواتا ہوں۔ انشاء اللہ تمہارا بیٹا مل جائے گا۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''پریشان کیسے نہ ہوں تھانے دار جی۔'' عابدہ رندھی ہوئی آواز میں بولی ''جوان جہاں بیٹا اچانک غائب ہو جائے تو ماں کو کہاں سکون آتا ہے۔ میں فاروق کے لیے بہت بے چین ہوں۔''

میں عابدہ کے درد کو سمجھ رہا تھا۔ قدرت نے ماں کے دل میں بڑے عجیب جذبات و احساسات بھرے ہیں۔ اس ہستی کی محبت کا جداگانہ انداز ہے جسے سمجھنا اولاد کے بس کی بات نہیں۔ یہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے۔ کسی ماں کی چاہے ایک ہزار اولادیں بھی کیوں نہ ہوں وہ ہر ایک کے دکھ اور تکلیف کو برابر محسوس کرتی ہے۔ محسوسات کا یہ توازن، انصاف کی ایک عمدہ مثال ہے اور بے شک، انصاف کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ شاید اسی لیے ماں کے قدموں تلے جنت کی بشارت پوشیدہ ہے۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا ''تین مئی کی

رات گھر میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟''

میرے نزدیک تین مئی کی رات اور چار مئی کی صبح زیادہ اہم تھیں۔ فاروق رات کو دیر سے گھر لوٹتا تھا اور اگلی صبح پھر نکل جاتا۔ میرے سوال پر میاں بیوی نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کریم جلدی سے بولا۔

''نہیں جی......ایسی تو کوئی بات نہیں!''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے عابدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا ''اور چار مئی کی صبح کو؟''

عابدہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہ رہی ہو لیکن کسی ''دشواری'' کے باعث اس کی زبان ساتھ نہ دے رہی ہو' کوئی مصلحت بیان کے آڑے آرہی ہو۔ میں مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا لہٰذا جواب دینا ضروری تھا۔ وہ ڈنڈی مارتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

''نن......نہیں......گھر میں تو سب ٹھیک ٹھاک ......ہے۔''

عابدہ اور کریم کے ردِّعمل نے مجھے باور کرادیا کہ ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کا مطلب تھا' تین مئی کی رات یا چار مئی کی صبح ان کے گھر میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں فاروق گھر سے غائب ہوگیا تھا اور یہ دونوں میاں بیوی اس واقعے کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہے تھے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا عابدہ کا ردِّعمل کریم کی کسی خاص ہدایت کا عکاس تھا!

میں تھوڑی دیر تک انہیں خاموشی سے گھورتا رہا پھر عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم اپنے بیٹے یوسف کے ساتھ باہر برآمدے میں جاکر بیٹھو۔ میں کریم سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کردی۔

یہ میری ایک چال تھی۔ میں عابدہ کی زبان کھلوانے کے لیے کریم کو چکر دے رہا تھا۔ میں اس سے پانچ منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر گفتگو کو ایک خاص زاویے پر موڑ لیا اور کرید کرید کر اس سے پوچھنے لگا کہ کہیں فاروق کا کسی لڑکی وغیرہ سے تو کوئی چکر نہیں تھا یا وہ کہیں شادی وغیرہ کے لیے ضد کررہا ہو! یہ ساری باتیں میں وقت گزاری کے لیے کررہا تھا تاکہ کریم کو کسی قسم کا کوئی شک نہ گزرے۔ اس نے میرے حسبِ توقع جواب دیا کہ فاروق ایسے کسی معاملے میں ملوث نہیں تھا۔ یہ اس کی ذاتی معلومات تھیں ویسے ان دونوں باپ بیٹے میں بڑی دوریاں حائل تھیں!

میں نے کہا ''ٹھیک ہے اب تم باہر جاکر بیٹھو اور عابدہ کو اندر بھیج دو۔''

''تھانے دار جی! ہم میاں بیوی ادھر آپ کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔'' کریم نے منت ریز لہجے میں کہا ''آپ یوسف کو جانے کی اجازت دے دیں تاکہ وہ ادھر لاری اڈے جاکر دکان تو کھول سکے۔ کل کا پورا دن بھی دکان بند رہی ہے۔''

وہ تینوں میرے احکام پر تھانے نہیں لائے گئے تھے لہٰذا میں نے کریم کی فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے پہلے تم یوسف ہی کو میرے پاس بھیجو۔ میں اسے فارغ کردیتا ہوں۔ جب وہ میرے کمرے سے نکل جائے تو تم اسے لاری اڈے روانہ کردینا اور عابدہ کو ادھر بھیج دینا۔''

وہ مجھے سلام کرکے کمرے سے نکل گیا۔

یوسف کو میں نے پانچ منٹ میں نمٹا دیا اور پھر عابدہ کی آمد پر میں اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ پہلے میں نے اس سے اسی قسم کے سوالات کیے جیسے کریم سے پوچھے تھے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کردی کہ باہر جاکر کریم کے سامنے وہ اپنے بیان کو یہیں تک محدود رکھے تاکہ اس کی چمڑی اور ہڈیاں سلامت رہیں۔ وہ میری بات کو سمجھ گئی اور بولی۔ ''اس کا مطلب ہے آپ نے کوئی اور خاص بات پوچھنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور معنی خیز انداز میں کہا ''اور تم جانتی ہو وہ خاص بات کیا ہوسکتی ہے!''

''آپ کا اشارہ اس رات والے جھگڑے کی طرف ہے نا۔'' عابدہ نے کہا۔

''تم بڑی عقل مند ہو۔'' میں نے سراہنے والے لہجے میں کہا ''اب مزید سمجھ داری کا ثبوت دو اور مجھے بتاؤ تین مئی کی رات کو تمہارے گھر میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' رات کا حوالہ دے کر اس نے چار مئی صبح کی خود ہی تردید کردی تھی لہٰذا مجھے آسانی ہوگئی۔ اس کے مزید اطمینان کے لیے میں نے کہا ''تم بےفکر رہو یہ باتیں صرف تمہارے اور میرے درمیان رہیں گی۔ کریم کو ان کی ہوا بھی نہیں لگے گی وہ پوچھے تو وہی بتانا جس کی میں نے تمہیں ہدایت کی ہے۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا اور پھر اس نے مجھے پورا واقعہ سنا دیا۔ میں یہاں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ عابدہ کے مطابق جب سے میں نے کریم کو تھانے بلاکر ڈانٹ ڈپٹ کی تھی، وہ خاصا سیدھا ہوگیا تھا لیکن وہ مسلسل اس کرید میں بھی تھا کہ آخر تھانے دار کو ان کے گھریلو معاملات کے

بارے میں کس نے بتایا۔ اسے عابدہ پر شک تھا اور اس شک کا اظہار وہ اٹھتے بیٹھتے کرتا رہتا تھا۔ عابدہ کے پیہم انکار سے برہم ہو کر تین مئی کی رات اس نے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ کر ڈالا۔ اس نے عابدہ کو بے دریغ کوٹا اور اس کے ساتھ ہی فاروق کو بھی بہت برا بھلا کہا۔ اسے فاروق سے ایک بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ کام دھندے میں اس کا ہاتھ نہیں بٹاتا تھا اور اس موقع پر تو فاروق ماں کا حمایتی بن کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ فاروق کے اس جرأت مندانہ اقدام سے پیشتر کریم نے اپنی بیوی کو جو مارلیا' سو مارلیا۔ بعد میں وہ عابدہ کو ہاتھ بھی نہ لگا سکا۔ اسی بیچم بیچ میں باپ بیٹے کے درمیان اچھی خاصی ہاتھا پائی بھی ہو گئی اور ایک مرحلے پر کریم نے اسے دھکا دے کر پرے پھینک دیا تھا۔ یوسف اس دوران میں زبانی کلامی اس جھگڑے کو ختم کروانے کی تگ ودو میں مصروف رہا تھا۔ بہرحال وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلی صبح فاروق حسب معمول گھر سے نکلا......اور پھر واپس نہ آیا۔

میں نے مزید چند سوالات کے بعد عابدہ کو فارغ کر دیا اور ان میاں بیوی کو تھانے سے جانے کی اجازت دے دی' اس وعدے کے ساتھ کہ میں ان کے جوان جہان بیٹے کو تلاش کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔

میں نے یہ کوشش کی بھی مگر مجھے فاروق کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میں نے فرید' سلطان اور مطلوب کو تھانے بلا کر انہیں اچھی طرح گھسا اور مانجھا' اس گاؤں اور آس پاس کے دیہات میں بھی بندے دوڑائے تاکہ فاروق کو ڈھونڈ نکالیں لیکن میری یہ تمام تر کوشش سعی لاحاصل میں ڈھل گئی۔ کریم نے اپنے طور پر سمن آباد لاہور سے بھی پتا کروالیا۔ فاروق وہاں بھی نہیں پہنچا تھا۔ گاؤں کا کوئی اور لڑکا یا لڑکی بھی غیر حاضر نہیں تھی جو ایک خاص انداز میں سوچا جاتا!

ایک ہفتے کی تگ ودو کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فاروق اپنے گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہو کر کہیں نکل گیا تھا۔ کہاں؟ اس بارے میں اس نے اپنے دوستوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں فرید' سلطان اور مطلوب سے اگلوالیتا۔ میں نے پوچھ تاچھ کے دوران میں ان پر اچھی خاصی سختی بھی کی تھی۔

ٹین ایج کو اگر انگریز نے خطرناک عمر قرار دیا ہے تو اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کسی قسم کے تعصب' اختلاف یا ناپسندیدگی سے قطع نظر انگریز کی عقل مندی' دور اندیشی اور موقع شناسی سے انکار ممکن نہیں!

فاروق سولہ سال کا تھا اور عمر کا یہ حصہ بہت ہی لاابالی اور جذباتی ہوتا ہے۔ والدین کے مابین پائی جانے والی ناچاقی اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی پھر اس افلاس زدہ خاندان پر گیارہ بہن بھائیوں کا بوجھ! ان عوامل نے پتا نہیں اس کے ذہن کی کیا حالت کر دی ہو جب کہ وہ کچھ کماتا دھماتا بھی نہیں تھا۔ یہ بنے بنائے ایسے حالات تھے جن سے تنگ آ کر کوئی بھی لڑکا گھر چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ فاروق بھی انہی زہر آلود حالات کا شکار ہو گیا تھا۔

بہرحال میں نے ہمت نہ ہاری۔ جلد یا بدیر اس کا سراغ ملنا ہی تھا۔ میں نے اپنی دیگر پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ فاروق کی تلاش میں بھی ''گھوڑے'' دوڑائے رکھے اس امید پر کہ کوشش کبھی بے نتیجہ نہیں ہوتی!

☆☆☆

پندرہ مئی کی رات میں عشا کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں علی الصباح اٹھنے کا عادی ہوں للٰہذا رات کو بھی جلدی بستر پر چلا جاتا ہوں۔ اگر کسی ایمرجنسی میں مصروف نہ ہوں تو رات کا کھانا میں عشا کی نماز سے قبل کھالیتا ہوں۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا ''کیا بات ہے فدا! تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''سر جی! کسی نے مستری کریم کو قتل کر دیا ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔

میں چونک اٹھا اور استفسار کیا ''تم سائیکلوں والے مستری کی بات کر رہے ہو؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا ''وہی جناب جس کا لڑکا ایک ہفتہ پہلے گم ہو گیا تھا۔ تھانے میں مستری کریم کی بیوی بیٹھی ہے۔ آپ جلدی سے آجائیں۔''

کانسٹیبل کی اطلاع بڑی سنسنی خیز تھی اور ظاہر ہے وہ دروغ گوئی نہیں کر رہا تھا۔ عابدہ ہی نے تھانے آ کر اسے بتایا تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا ''ٹھیک ہے تم چلو میں آرہا ہوں۔''

میں نے یونیفارم کا تکلف ضروری نہ جانا اور پانچ منٹ بعد سادہ لباس ہی میں تھانے پہنچ گیا پھر میرے حکم پر عابدہ کو میرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہ اپنے سات سالہ بیٹے نوید کے ساتھ تھانے آئی تھی۔

عابدہ کی حالت بڑی افسوس ناک تھی۔ اسے بات کرنے میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل

جاری تھے۔ میں نے کوشش کر کے اس سے پوچھ لیا کہ کریم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج شام کسی نے کریم کو دکان میں قتل کر دیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی جلال دین کو ساتھ لیا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

کریم کی سائیکلوں والی دکان لاری اڈے کے قریب تھی۔ مذکورہ دکان ایک نیچی چھت والے کمرے پر مشتمل تھی۔ روڈ اور اس کمرے کے درمیان اچھی خاصی جگہ خالی پڑی تھی جس کا بیشتر حصہ کریم ہی کے استعمال میں تھا۔ وہ دکان کے سامنے اپنے آلات پھیلا لیتا اور اس سے آگے وہ سائیکلیں ایک قطار میں کھڑی ہوتیں جنہیں وہ کرائے پر چلاتا تھا۔ کمرے کو درحقیقت سامان رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ دکان بند کرتے وقت وہ تمام سائیکلوں کو کمرے میں رکھ دیتا اور باہر سے تالا لگا کر گھر چلا جاتا۔

جب میں اس کی دکان پر پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ دکان کے اندر اندھیرا تھا لہٰذا کارروائی کے لیے ٹارچ اور لالٹین کا استعمال کرنا پڑا۔ اسی دوران میں میری ہدایت پر اے ایس آئی لاری اڈے..... سے ایک ویگن والے کو پکڑ لایا۔ مذکورہ ویگن کی ہیڈ لائٹس نے ہمارا کام اور آسان کر دیا۔

کریم کی لاش دکان کے اندر پڑی تھی۔ اس کی گردن پر سائیکل والی ٹیوب کو کس کر باندھا گیا تھا۔ گرہ اتنی مضبوط تھی کہ حلقوں سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ قاتل نے بڑی وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ کریم کو دیکھ کر ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ اب اس دنیا کا باسی نہیں رہا تھا۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد یہ انکشاف بھی ہوا کہ کریم کے سر میں کسی آہنی شے سے ایک خطرناک چوٹ بھی لگائی گئی تھی۔ کھوپڑی کا متاثرہ حصہ کھل گیا تھا اور وہاں سے اچھا خاصا خون بھی خارج ہوا تھا۔ تھوڑی تلاش کے بعد میں اس آہنی شے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جس کی شدید ضرب نے کریم کی کھوپڑی کو چٹخا دیا تھا۔

وہ سائیکل میں ہوا بھرنے والا پمپ تھا جس کے نچلے حصے پر سر کے بال اور خون کے دھبے موجود تھے۔ ان چند بالوں اور خون کا تعلق یقیناً مقتول کریم ہی سے تھا۔ لیبارٹری رپورٹ اس کی تصدیق کر سکتی تھی۔ اس وقت میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کریم کی موت سر میں لگنے والی چوٹ سے واقع ہوئی تھی یا گردن گھٹنے سے اس کی سانس کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی اس حقیقت کو بے نقاب کر سکتی تھی۔

میں نے جائے واردات یعنی اس کمرے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ایک دیوار کے ساتھ بڑی ترتیب سے چار سائیکلیں کھڑی تھیں۔ سائیکل مرمت کا سامان اور دیگر اوزار بھی نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کا ایک بڑا سا بکس ایک کونے میں رکھا تھا۔ غالباً وہ بکس، ٹول بکس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایک دیوار پر نصب مختلف کھونٹیوں پر نئے اور پرانے ٹائر ٹنگے دکھائی دیتے تھے۔ الغرض پوری ''دکان داری'' موجود تھی لیکن دکان دار اب دکان داری کے قابل رہا تھا اور نہ ہی وہ کسی بیمار سائیکل کا ''علاج'' کر سکتا تھا۔ اسے موت نامی لاعلاج مرض نے زندگی کے بکھیڑوں سے آزاد کر دیا تھا۔

میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کیا اور کارروائی مکمل کرنے کے بعد کریم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دیا۔ موقع پر کریم کا بڑا بیٹا یوسف موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھا اور ابتدائی پوچھ گچھ شروع کر دی۔ عابدہ کو میں نے گھر روانہ کر دیا تھا اور کہا تھا، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا اس کے پاس پہنچوں گا اور اس سے ضروری سوالات کروں گا۔ وہ بے چاری چھوٹے بیٹے کے ساتھ خوامخواہ ادھر ادھر خوار ہوتی پھر رہی تھی۔

وہ اگرچہ گرمیوں کا موسم تھا لیکن اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے اس لیے لاری اڈے کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ اِکّا دُکّا دکانوں کے سوا باقی سب بند تھیں۔ مقتول کریم کی دکان کی ایک جانب چائے والے کا کھوکھا تھا اور دوسری طرف پھل والے کی دکان تھی اور اس وقت وہ دونوں بند تھیں۔ لاری اڈے پہ پوچھ پڑتال سے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے کریم کی دکان کو تالا لگوایا اور یوسف کے ساتھ اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں یوسف کی زبانی مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ یوسف اس دکان پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ دکان صبح آٹھ بجے کھلتی اور شام چھ بجے بند کر دی جاتی یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ بجے تک وہاں تالا لگ جاتا۔ کریم کا کہنا تھا کہ مغرب کی اذان سے پہلے اپنے کاروبار کو سمیٹ لینا چاہیے۔

دکان کھولنے کی ذمے داری یوسف کی تھی۔ مقتول کریم لگ بھگ نو بجے دکان پر پہنچتا۔ شام کو یوسف اپنے باپ سے پہلے نکل جاتا اور دکان کریم بند کرتا۔ اس روز بھی یوسف اپنے معمول کے مطابق ساڑھے پانچ بجے دکان سے چلا گیا تھا اور اس وقت تک اس کا باپ کریم دکان میں زندہ سلامت تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا اسے ساڑھے پانچ کے بعد قتل کیا گیا تھا۔

میں نے یوسف سے پوچھا ''کیا تمہارے باپ کی کسی

سے دشمنی وغیرہ بھی تھی؟''

''اس کے پاس دوستی اور دشمنی کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ خیال افروز لہجے میں بولا ''ابا دن بھر دکان میں مصروف رہتا اور یہاں سے جانے کے بعد اس کا سارا وقت گھر میں گزرتا تھا۔''

میں نے کہا ''یوسف! تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔ تمہارے باپ کو جس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' قاتل اس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ نفرت رکھتا تھا۔ اس نے نہ صرف کریم کے سر پر ایک خطرناک وار کیا بلکہ سائیکل کی ٹیوب کی مدد سے بے دردانہ انداز میں اس کا گلا بھی گھونٹ ڈالا۔ کوئی بھی شخص ایسی وحشیانہ کارروائی خواہ مخواہ نہیں کرسکتا!''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ افسردہ انداز میں سر جھٹکتے ہوئے بولا ''میں اس وقت بہت پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کیا اور کیسے ہو گیا!''

یوسف کی پریشانی بجا تھی۔ ایک جوان بیٹا اپنے باپ کی موت پر غمزدہ نہیں ہوگا تو پھر کون ہوگا۔ میں چند لمحے خاموش رہ کر اس کا جائزہ لیتا رہا پھر پوچھا۔

''ذرا سوچ کر بتاؤ' آج کل میں کریم کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا تھا؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان لمحات میں اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا تھا' متامل لہجے میں بولا ''کل شام کو ایک بچے سے اس کی منہ ماری تو ہوئی تھی لیکن گلزار اتنا بڑا اقدم تو نہیں اٹھا سکتا!'' بات کے اختتام تک اس کے لہجے میں بے یقینی موجود رہی۔

میں نے پوچھا ''یہ گلزار کون ہے اور کس بات پر اس سے تلخ کلامی ہوئی تھی؟''

یوسف چند لمحے کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر جواب دیا ''گلزار علی نواز کا بیٹا ہے۔ عمر بارہ تیرہ سال ہوگی وہ اکثر ہماری دکان سے کرائے پر سائیکل لے کر جاتا ہے۔ کرایہ دینے کی باری آتی ہے تو کہتا ہے کل دے دوں گا۔ اس کی طرف اچھی خاصی رقم چڑھ گئی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ ابا سے کہا بھی کہ یہ ادھار والا معاملہ ٹھیک نہیں۔ جو رقم اس کی طرف ہے اسی پر صبر کرلیں اور آئندہ کے لیے گلزار کو سائیکل نہ دیں لیکن ابا اس معاملے میں بڑا نرم واقع ہوا تھا۔ کہتا تھا دکان داری میں یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے بہرحال......'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''جب سے فاروق گھر چھوڑ کر گیا ہے ابا بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ بات بے بات پر لڑائی جھگڑا کرنے لگتا ہے۔ کل شام کو بھی جب گلزار نے سائیکل کا کرایہ نہیں دیا تو ابا نے اسے اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔ ابا کا غصہ زبانی کلامی سے آگے بڑھ گیا تھا اور طیش میں آکر اس نے گلزار کے کان بھی مروڑ دیے تھے وہ روتا ہوا ہماری دکان سے چلا گیا تھا۔''

یہ ایک معمولی سا اور غیر اہم واقعہ تھا۔ ظاہر ہے کریم کی سرزنش پر ایک تیرہ سالہ بچہ انتقاماً اسے قتل تو نہیں کرسکتا تھا۔ سائیکل کی ٹیوب کو کریم کی گردن میں جس طرح باندھا گیا تھا وہ کسی تیرہ سالہ بچے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی طرح ہوا بھرنے والے پمپ کا مہلک وار بھی گلزار سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ کریم ایسا بھی مٹی کا مادھو نہیں تھا کہ گلزار سے زیر ہو جاتا۔

میں نے گلزار کے ذکر کو گول کردیا اور یوسف سے پوچھا ''کیا تم دکان سے نکلنے کے بعد سیدھے گھر جاتے ہو؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی ''میں لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے دکان کو چھوڑ دیتا ہوں اور سیدھا بڑے میدان میں پہنچتا ہوں۔ وہاں گاؤں کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہیں مجھے بھی اس کھیل کا بہت شوق ہے۔ اسی لیے میں ابا سے پہلے دکان سے نکل آتا ہوں۔''

''بڑے میدان میں کھیل کود سے تم کب تک فارغ ہو جاتے ہو؟''

''سات' سوا سات تک۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر گھر چلے جاتے ہو گے۔''

''پانچ دس منٹ تک ادھر میدان ہی میں رہتے ہیں۔'' یوسف نے بتایا ''جب سانسیں ہموار ہو جاتی ہیں تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا ''ساڑھے سات اور آٹھ بجے کے درمیان میں گھر پہنچ جاتا ہوں۔''

''اور تمہارا باپ کب تک گھر پہنچ جاتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''عموماً ساڑھے چھ بجے تک۔''

''کیا آج بھی تم کھیل کے میدان سے فارغ ہونے کے بعد آٹھ سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر چند لمحات کے توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''میں گھر میں داخل ہوا تو اماں نے بتایا کہ ابا ابھی تک گھر نہیں آیا۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی اس لیے مجھے حیرت ہوئی اور میں ابا کو دیکھنے دکان کی طرف چلا گیا اور پھر......'' وہ یہاں تک پہنچ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے گہرا دکھ

جھلک رہا تھا۔ چند لمحات کے وقفے کے بعد اس نے غمزدہ لہجے میں بتایا۔

''پھر میں نے دکان کے اندر ابا کو بے ڈھنگے انداز میں پڑے دیکھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے ماچس جلائی تو اس کی ناکافی روشنی میں میں نے ابا کی گردن میں بندھی ہوئی سائیکل کی ٹیوب دیکھ لی۔ میں تیلی پر تیلی جلاتا گیا اور پھر یہ خوفناک حقیقت مجھ پر کھل گئی کہ ابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' وہ خاموش ہوا تو میں نے استفسار کیا۔

''میں سیدھا گھر پہنچا اور اماں کو جا کر صورت حالات سے آگاہ کیا۔'' وہ رنجیدہ لہجے میں بولا ''گھر میں فوراً ماتم کی سی فضا قائم ہوگئی۔ میرے بہنیں اور چھوٹے بھائی ابا کی موت کا سن کر زار و قطار رونے لگے۔ میں اماں اور ان سب کو تسلی دلاسے دیتا رہا۔ پھر اماں مجھے ساتھ لے کر دکان پر آگئی۔ گھر سے نکلتے وقت ہم لالٹین بھی ساتھ لے آئے تھے۔ اماں کا انداز بتاتا تھا شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا مگر جب اس نے اپنی آنکھوں سے ابا کی لاش کو دیکھ لیا تو دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ ابا جیسا تیسا بھی تھا اس کا خاوند تھا اور ہم سب کا کفیل بھی! یہ سچ ہے کہ میں بھی دن بھر ابا کے ساتھ محنت کرتا ہوں لیکن ابا کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے۔ وہ تو ہم سب کے سر کا سایہ تھا۔''

اتنا کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوگیا۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا اور قدم قدم اس کے گھر کی طرف بڑھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی بول اٹھا۔

''ہمیں رونے دھونے سے تھوڑی فرصت ملی تو میں نے اماں کو تھانے بھیج دیا تاکہ آپ کو اس واقعے کی اطلاع دی جاسکے اور خود میں ابا کی لاش کے پاس رک گیا تھا۔''

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا ''یوسف! جب تم کریم کو ڈھونڈتے ہوئے اپنی دکان پر پہنچے تو دکان کا دروازہ بند تھا؟''

''دروازہ بھڑا ہوا تھا مگر اس میں تالا نہیں لگا تھا۔'' اس نے جواب دیا ''دکان کے اندر جانے کے بعد مجھے پتا چلا دکان کا تالا اپنی کھونٹی پر موجود تھا۔''

اس نے مجھے بتایا کہ صبح دکان کھولنے کے بعد وہ چابی سمیت تالے کو دیوار میں نصب ایک کھونٹی پر لٹکا دیتا تھا اور دن بھر وہ چابی تالا دکان کے اندر ہی رہتا تھا۔ میں جب جائے وقوعہ پر پہنچا تھا تو میں نے ''آلات مرمت و جراحت سائیکلاں'' کو دکان کے اندر پایا تھا۔ ازیں علاوہ کرایے پر چلنے والی سائیکلیں بھی ایک دیوار کے ساتھ ترتیب سے کھڑی تھیں۔ اس حوالے سے میں نے یوسف سے پوچھا۔

''کیا دکان کا ساز و سامان تم نے اٹھا کر کمرے کے اندر رکھا تھا؟''

''نہیں وہ پہلے سے اندر موجود تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کریم نے ''دکان داری'' سمیٹ لی تھی جب قاتل وہاں پہنچا!'' میں نے پرخیال انداز میں کہا ''اور پھر قاتل نے اسے دکان بند کرنے کا موقع نہ دیا۔''

یوسف نے میرے خیال کی تائید کردی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ان کے گھر پہنچ گئے۔ رات آدمی کے قریب گزر چکی تھی لیکن یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس مکان کے کسی مکین کو نیند نہیں آسکتی تھی۔ آس پڑوس کی چند عورتیں بھی گھر میں موجود تھیں اور ان کی موجودگی نے مقتول کریم کے چھوٹے سے گھر کو اور بھی چھوٹا کر دیا تھا۔ اس ناکافی در و دیوار پر پہلے ہی افراد خانہ کا اچھا خاصا بوجھ تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں بیٹھک نما ایک چھوٹے سے کمرے میں عابدہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمارے سوا اس کمرے میں اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ عابدہ کو نارمل کر کے بات چیت کے قابل بنانے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ کریم نے زندگی بھر اسے کوئی قابلِ ذکر سکھ نہیں دیا تھا اور جاتے جاتے بھی ایک ناقابلِ فراموش غم دیا گیا تھا۔ کریم نے عابدہ کو بھی بچے پیدا کرنے والے ایک مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ بے زبان دھاتی مشین کو اپنی کارکردگی ظاہر کرنے کے لیے صرف تیل پانی اور تھوڑی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انسان کو کسی مشین کے برابر کھڑا کر کے اسی سلوک سے گزارنا انسانیت نہیں۔ بہرحال کریم گھر کا مجازی پروردگار تھا لہٰذا ہزار اختلافات اور شکایات کے باوجود بھی اس کا زیاں گھر کے ہر فرد کو ناقابلِ برداشت صدمے سے دوچار کر گیا تھا۔

''مجھے کریم کی موت کا بڑا دکھ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا ''میں اس کے قاتل کو قرارواقعی سزا دلوانے کی پوری کوشش کروں گا۔ قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا عابدہ!''

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور دل خراش لہجے میں بولی ''میں آپ سے کس قسم کا تعاون کروں تھانے دار صاحب؟''

''تم قاتل کی نشاندہی کر سکتی ہو۔'' میں نے اس کے

چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''تمہیں اندازہ ہوگا کریم کو کون قتل کرسکتا ہے؟''

وہ روہانسی آواز میں بولی ''کوئی اس کا دشمن نہیں تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا، اس کی جان لے کر کسی کو کیا ملا ہوگا۔ آج تک کسی سے اس کا معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا۔''

لفظ ''جھگڑے'' پر میرے ذہن میں ایک جگنو سا چمکا۔ یوسف نے مجھے بتایا تھا کل شام میں کسی گلزار نامی لڑکے سے مقتول کریم کی اچھی خاصی گرما گرمی ہوگئی تھی۔ کریم کو جس انداز میں قتل کیا گیا تھا اس کے پیش نظر کسی بارہ تیرہ سالہ لڑکے کی طرف تو دھیان نہیں جاسکتا تھا تاہم میں نے اس سلسلے میں عابدہ سے استفسار ضروری سمجھا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ کل شام علی نواز کے بیٹے گلزار سے کریم کا جھگڑا ہوگیا تھا۔'' میں نے کہا ''کریم نے غصہ دکھانے کے ساتھ ساتھ گلزار کے کان بھی مروڑ دیے تھے جس کے نتیجے میں وہ روتا ہوا وہاں سے گیا تھا۔ کیا رات کو کریم نے تمہیں اس بارے میں بتایا تھا؟''

''ہاں بتایا تھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''اور یہ قصہ سنانے کے بعد مجھے بری طرح مارا کوٹا بھی تھا۔ ابھی تک میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی...... گرا گدھے سے اور غصہ کمہار پر!'' اس نے برا سا منہ بنایا ''اس کا بس مجھ پر چلتا تھا اس لیے سارا غصہ مجھ پر نکال لیا۔ اصولی طور پر تو اسے علی نواز سے جا کر جھگڑا کرنا چاہیے تھا مگر علی نواز سے الجھنے میں اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ چھوٹے سے بچے کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔''

عابدہ کی مبنی بر تلخی باتوں میں متعدد انکشاف ''پوشیدہ'' تھے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اضطراری انداز میں پوچھا ''علی نواز سے ڈرنے کی کیا وجہ ہے اور کس چھوٹے بچے نے تمہارے خاوند کو دھمکی دی تھی؟''

''میں گلزار کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی ''جب کریم نے اس کے کان مروڑے اور وہ رونے لگا تو اسی رونے کے دوران میں گلزار نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ ابھی جا کر اپنے باپ کو بتائے گا...... اور اس کا باپ علی نواز، کریم کی ایسی تیسی کر کے رکھ دے گا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بتایا۔

''ایک کریم ہی کیا، علی نواز سے تو اکثر لوگ ڈرتے ہیں، بھلا غنڈوں اور بدمعاشوں کے کون منہ لگے گا!''

''کیا علی نواز اس علاقے میں بدمعاشی کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میں جب بھی کسی نئی جگہ پر جاتا تھا تو سب سے پہلے وہاں کے شرپسند عناصر کی فہرست تیار کرتا تھا کیونکہ ایک تھانے دار کا زیادہ تر سابقہ انہی افراد سے پڑتا ہے۔ میں نے اپنے ماتحت عملے کی مدد سے یہاں کی جو فہرست مرتب کی تھی اس میں کسی علی نواز کا نام موجود نہیں تھا۔ عابدہ کی بات سن کر اسی لیے مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔

اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ''علی نواز ایک شریف بدمعاش قسم کا آدمی ہے۔ وہ عام روایتی بدمعاشوں کی طرح کھلم کھلا غنڈا گردی نہیں کرتا مگر ضرورت پڑنے پر غنڈوں سے بڑھ کر کہیں غنڈا ثابت ہوتا ہے۔ ایسی دو تین مثالیں موجود ہیں کہ اس نے گلزار کی خاطر دوسروں کو بے دریغ پیٹ ڈالا۔ گلزار، علی نواز کا بہت ہی لاڈلا بچہ ہے۔ وہ اس کی غلط باتوں کی بھی حمایت پر اتر آتا ہے۔''

میں نے اپنی یادداشت میں علی نواز کے نام پر سرخ دائرہ لگایا اور عابدہ سے پوچھا ''علی نواز کرتا کیا ہے؟''

''اس کی شربت کی دکان ہے۔'' عابدہ نے بتایا ''اور ساتھ ہی برف کے گولے بھی بیچتا ہے۔''

میں مزید پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کہا ''عابدہ! مجھے افسوس ہے میں ابھی تک تمہارے بیٹے فاروق کا کوئی سراغ نہیں لگا سکا اور اب تم پر ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑی ہے بہرحال!''

میں نے تھوڑا توقف کر کے ہمدردانہ نظر سے اسے دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا ''فاروق کے بارے میں تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گھر کی زہریلی فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا ہے...... اور اپنی ہی مرضی سے واپس بھی آئے گا تاہم تم فکر نہ کرو، کریم کے قاتل کو تم بہت جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھو گی!''

ان لمحات میں ایک دکھی اور شکستہ دل عورت کو میں تسلی اور امید کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ عابدہ کی آنکھوں میں ٹمٹماتے امید و بیم کے چراغوں نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میں اس عورت کی بھرپور مدد کا عزم کر کے اس کے گھر سے نکل آیا۔

آئندہ روز میں نے علی نواز، خوشی محمد اور عبدالرحمن کو بلانے کے لیے بندے دوڑا دیے۔ خوشی محمد اور عبدالرحمن مقتول کے کاروباری پڑوسی تھے۔ کریم کی دکان کی ایک طرف

خوشی محمد کا چائے بسکٹ وغیرہ کا کھوکھا تھا اور جانب دیگر عبدالرحمٰن پھل کی دکان چلاتا تھا۔ میں ان دونوں افراد سے کوئی گھنٹا پونا گھنٹا پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن ایسی کوئی مفید بات سامنے نہ آسکی جو کریم کے قاتل تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی۔ وقوعہ کے روز ان دونوں نے کریم سے پہلے اپنا روزگار سمیٹ لیا تھا لہٰذا کریم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ دونوں جب تک اپنی دکانوں پر موجود رہے انہوں نے علی نواز کو ''کریم سائیکل ورکس'' پر کھڑے یا کریم سے بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ کریم کی کسی بھی شخص سے ایسی دشمنی نہیں تھی کہ وہ یوں سفاکی اور بیدردی سے اسے قتل کر ڈالتا!

یہی بات میری الجھن کا باعث تھی۔ میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور کریم کی لاش کا بھی تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ اس گیارہ بچوں کے باپ کو جس انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا' قاتل اپنے اندر کریم کے لیے بہت ہی عناد نفرت اور غصہ رکھتا تھا۔ سردست کریم کا ایسا کوئی دشمن منظر پر دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے علی نواز کے!

عابدہ نے علی نواز کی جو ''خصوصیات'' بیان کی تھیں ان کی روشنی میں اس کی طرف سے ایسے سنگین اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی اور علی نواز اس دن ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ آج صبح ہی کسی ضروری کام سے دوسرے ضلع چلا گیا تھا۔ کریم والے سنسنی خیز واقعے کے بعد اچانک اسے کوئی ضروری کام پڑ جانا بھی ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات ابھارنے کا باعث تھا۔

میں نے علی نواز کی گھر والی کو تاکید کر دادی کہ اس کا خاوند جیسے ہی لوٹے وہ اسے میرے پاس تھانے بھیج دے۔ اگر علی نواز کی بیوی کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ کس کام سے کہاں گیا ہے تو میں اپنا ایک بندہ ادھر بھی دوڑا دیتا مگر وہ بے چاری اپنے خاوند کے ضروری کام اور روانگی کے صحیح مقام سے بے خبر تھی۔ تاہم میں نے دو سادہ لباس کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ اس گاؤں میں اور آس پاس کے علاقوں پر گہری نظر رکھیں اور جیسے ہی علی نواز کہیں دکھائی دے وہ اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔

یہ دونوں وہی کانسٹیبلز تھے جو گمشدہ فاروق کی تلاش پر بھی مامور تھے لیکن ابھی تک انہیں اس سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی!

☆☆☆

دوسرے دن یعنی سترہ مئی کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ اس رپورٹ کے مطابق کریم کی موت پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ سامان سمیٹ کر جیسے ہی دکان بند کرنے والا تھا' قاتل وہاں پہنچ گیا اور اس نے کریم کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

کریم کی لاش کے ساتھ اسپتال سے جو فائل آئی تھی ان رپورٹس کا لب لباب یہ تھا کہ پہلے کریم کے سر پر ہوا بھرنے والے پمپ سے ایک مہلک وار کیا گیا تھا اور ازاں بعد سائیکل کی ٹیوب کو کس کے اس کی گردن کے گرد باندھ دیا گیا تھا جس کے باعث کریم کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور اسی دوران میں اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا دستور نہیں تھا۔ عدالت اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی ورنہ ہوا بھرنے والے پمپ سے انگلیوں کے نشانات حاصل کر کے ممکنہ قاتل تک پہنچنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

فنگر پرنٹس کا خیال جس کسی کا بھی ہے اس کے لیے دل سے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔ اس تکنیک نے تفتیشی میدان میں بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ آج کل کی پولیس کو اس کے علاوہ بھی بہت سی سہولیات میسر ہیں مگر ہمارے زمانے میں سب کچھ زور بازو پر خود ہی کرنا پڑتا تھا!

ضروری قانونی کارروائی کے بعد میں نے کریم کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش عابدہ کے حوالے کر دی۔ اسی روز عصر اور مغرب کے درمیان اس کی تدفین ہوگئی۔

اگلے روز مجھے اطلاع ملی کہ علی نواز گھر واپس آگیا ہے۔ میں نے فوراً اسے تھانے بلوالیا۔ وہ گزشتہ روز رات گئے لوٹا تھا۔ میرے ''بلاوے'' پر وہ ٹھیک نو بجے صبح تھانے میں موجود تھا۔ میں نے کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے سرتاپا گہری نظر سے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔

علی نواز ایک لحیم شحیم اور قد آور شخص تھا۔ اس کے ڈیل ڈول میں بڑی ''تاثیر'' پائی جاتی تھی اس کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس ''متاثر کن'' شخصیت پر اس نے خاصی صحت مند مونچھیں بھی پال رکھی تھیں۔

میرے مسلسل گھورنے نے اسے مضطرب کر دیا اور وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! آپ نے کس سلسلے میں مجھے تھانے بلایا ہے؟''

''سلسلہ بہت دلچسپ اور عجیب ہے علی نواز!'' میں نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''مجھے پتا چلا ہے تم بڑی دکھری ٹائپ کے جی دار ہو۔ جس کی جی چاہے دھلائی کر کے رکھ دیتے ہو۔ لوگ تم سے ڈرتے ہیں کیونکہ تم بہت ہی خودسر اور جھگڑالو قسم کے آدمی ہو!''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟'' وہ بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے تیز آواز میں کہا ''زیادہ اداکاری کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے بہت سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے تم بڑے کامیاب شریف بدمعاش ہو۔''

''شریف بدمعاش؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں دہرایا۔

''میں نے کہا ہے نا' اداکاری کی کوئی گنجائش نہیں۔'' میں نے اسے سرزنش کی پھر اچانک زاویہ سوالات تبدیل کرتے ہوئے پوچھا ''تم دو تین دن سے کہاں غائب تھے؟''

''جی میں چنن پور گیا ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

موضع چنن پور دوسرے ضلع میں واقع تھا۔ میں نے سوال کیا ''تمہیں چنن پور میں ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا کہ بیوی بچوں کو بتائے بغیر تم ادھر روانہ ہو گئے؟''

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ''میں صغراں کو بتا کر گیا تھا جی۔'' اس کی آنکھوں نے مجھے صاف بتا دیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا ''صغراں نے مجھے بتایا ہے آپ نے میرے گھر بھی ایک بندہ بھیجا تھا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر منت ریز لہجے میں بولا ''صغراں کی مت الٹی ہے جو بات یاد رکھنے کی ہو اسے بھول جاتی ہے اور بھولنے والی بات کو......''

''تمہاری بیوی کی مت الٹی ہے یا سیدھی' اس سے تو مجھے کوئی سروکار نہیں۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سخت لہجے میں کہا ''لیکن جب میں تمہیں چھت والے کنڈے میں الٹا لٹکا کر پنکھے کے مانند گھماؤں گا تو تمہاری مت ضرور ٹھکانے آ جائے گی!''

''پر میں نے کیا کیا ہے تھانے دار جی؟'' وہ احتجاجی انداز میں بولا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا ''تم نے بہت برا کیا ہے علی نواز بتاؤ' بے چارے کریم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا تم نے اسے کیوں قتل کیا؟''

بات ختم کرتے ہی میں بڑی توجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا تاکہ میرے چھوڑے ہوئے تیروں میں سے اگر کوئی نشانے پر جا بیٹھے تو مجھے اس کی خبر ہو سکے مگر اس نے میری توقع کے برخلاف ردِعمل ظاہر کیا۔ اس کے احتجاجی لہجے کی شدت بڑھ گئی اور وہ خاصی بلند آواز میں چیخا۔

''آپ مجھے کریم مستری کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔ یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔''

''چیخنے چلانے کی فی الحال ضرورت نہیں۔'' میں نے ڈانٹ بھرے لہجے میں کہا ''اس صلاحیت کی تمہیں بعد میں زیادہ ضرورت محسوس ہوگی جب ٹرائل روم میں' میں تمہارا چیک اپ کروں گا اور جہاں تک زیادتی والی بات ہے......'' میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے صرف زیادتی کا نام ہی سنا ہوگا اس کے حقیقی مفہوم سے تو تمہیں میں واقفیت دلاؤں گا۔ سیدھی طرح بتا دو تم نے کریم کو کیوں قتل کیا؟''

''میں نے کسی کریم کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کوئی پاؤڈر میرے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔'' وہ برہمی سے بولا ''آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں اور......''

میں نے علی نواز کے عقب میں کھڑے حوالدار کو مخصوص اشارہ کیا اور اگلے ہی لمحے علی نواز کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ حوالدار شیر علی نے اس کی گردن پر ایک نپا تلا تکلیف دہ وار کیا تھا۔ علی نواز کے حلق سے پردرد آواز خارج ہوئی تو میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں کہا۔

''میں تم پر واضح کر چکا ہوں میرے سامنے چیخنے چلانے کا کوئی کام نہیں۔ اس کا تمہیں بھرپور موقع دیا جائے گا جب سیدھی طرح تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے۔ سمجھ گئے یا کسی اور طریقے سے سمجھانے کی کوشش کروں؟''

اس کے لہجے میں قدرے نرمی پیدا ہوئی تاہم احتجاج کا عنصر شامل رہا ''تھانے دار صاحب! آپ کس بنا پر مجھے کریم کے قتل میں ملوث کر رہے ہیں؟''

''بنا تمہارا بچونگڑا ہے......گلزار۔''

''گل......زار...... اس نے کیا کیا ہے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسے بتایا کہ چودہ مئی کی شام مقتول نے اس کے بیٹے گلزار کو اچھا خاصا ڈانٹ دیا اور کان مروڑنے کے بعد اپنی دکان سے بھگا دیا تھا۔ گلزار نے روتے ہوئے مقتول کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے باپ سے شکایت کر کے مقتول کی ایسی کم تیسی کروا دے گا۔ اس تفصیل کے اختتام پر میں نے عابدہ سے حاصل ہونے والی معلومات

کی روشنی میں کہا۔
''علی نواز! تمہارے کھاتے میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب تم نے گلزار کی شکایت پر خود سے کمزور افراد کی ایسی کم تیسی کی ہے۔ کہو تو میں وہ تمام واقعات تمہارے سامنے دہرادوں؟''
وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ''جناب! یہ درست ہے میں اپنے بیٹے کی وجہ سے بہت جلد جذباتی ہو جاتا ہوں اور اس کی خاطر میں نے کئی لوگوں سے جھگڑا بھی کیا ہے۔ کیا کروں میں گلزار والے معاملے میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ یہ میری اکلوتی اولاد ہے اور بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا ہے لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں' کریم کے قتل سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں۔''
''کیا گلزار نے چودہ مئی کی شام تم سے کریم کے رویے کی شکایت نہیں کی تھی؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔
وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''گلزار نے روتے ہوئے مجھے وہ تمام واقعہ سنایا تھا۔''
''اور تم نے اپنے بیٹے کو صبر کی تلقین کردی؟'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا'' حالانکہ تم اس کی چھوٹی موٹی شکایت پر بھی پہاڑ گرانے اٹھ کھڑے ہوتے ہو!''
''آپ میرے جذبات کی بالکل درست ترجمانی کررہے ہیں۔'' وہ بے خوف اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا'' کریم کی زیادتی کا احوال سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا لیکن میں نے گلزار کو یہ تسلی دے کر چپ کرادیا تھا کہ میں کریم سے خود بات کروں گا اور کرایے کی مد میں واجب الادا رقم بھی کریم کو دے دوں گا۔''
''حالانکہ یہ تمہارے مزاج کے خلاف تھا؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔
وہ رکھائی سے بولا'' جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اب آپ کی مرضی ہے یقین کریں یا نہ کریں۔''
حوالدار شیر علی نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں انٹری دیتے ہوئے مجھ سے کہا'' ملک صاحب! علی نواز ٹیڑھی کھیر ہے' سیدھی انگلی سے کام نہیں چلے گا۔ میں درخواست کرتا ہوں آپ اسے میرے حوالے کردیں۔''
میں نے علی نواز کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے'' دوستانہ'' انداز میں استفسار کیا'' کیوں بھئی! کیا ارادہ ہے؟''
''آپ اگر میرے ساتھ زیادتی کرنا ہی چاہتے ہیں تو میں کیا کہوں۔'' وہ غصہ بھری بے چارگی سے بولا'' لیکن آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے کریم کو قتل نہیں کیا اور یہی حقیقت ہے!''
حوالدار نے اس کی پنڈلی پر ایک زوردار ٹھڈا رسید کیا اور اسے کالر سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے دہاڑا'' جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہو۔ ہم تھانہ لگائے کس لیے بیٹھے ہیں؟''
میں نے حوالدار سے کہا'' شیر علی! ایک دن کے لیے یہ تمہارا مہمان ہے۔ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے نتائج چاہئیں۔''
''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' حوالدار نے معنی خیز انداز میں کہا'' اسے میری خاطر داری بہت'' راس'' آئے گی۔''
بات ختم کرتے ہی اس نے علی نواز کو گھسیٹ لیا۔ کالر کو پہنچنے والے جھٹکے نے علی نواز کو حوالدار کی جانب بڑھنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے آنکھ دبائی اور علی نواز کو مزید خوفزدہ کرنے کے لیے حوالدار سے کہا۔
''سب سے پہلے اس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرلو۔ ہم ان نشانات کا آلۂ قتل پر پائے جانے والے نشانات سے موازنہ کریں گے۔''
میں جانتا ہوں اس کارروائی کی کوئی اہمیت نہیں تھی تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہاتھ آجاتا کہ اگر علی نواز' کریم کے قتل میں ملوث تھا تو وہ فنگر پرنٹس سے ڈر سے بہت کچھ اگلنے پر آمادہ ہو جاتا۔ بعض اوقات بے نام خوف بھی حقیقت کو آشکار کردیتا ہے۔
وہ دن کسی خاص واقعے کے بغیر گزر گیا۔ دوپہر کے بعد صغراں اپنے اکلوتے بیٹے گلزار کے ساتھ تھانے پہنچی۔ وہ اپنے شوہر کی حراست کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں علی نواز کو چھوڑ دوں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کیا وہ جانتی ہے کہ میں نے اس کے شوہر کو تھانے میں کیوں بند کیا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ اسے لوگوں کی زبانی پتا چلا ہے' علی نواز کو کریم کے قتل کے شبہے میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا شوہر قاتل نہیں ہوسکتا!
بہرحال میں نے اسے تسلی دی کہ اگر علی نواز کریم کے قتل میں ملوث نہیں تو میں اسے بہت جلد چھوڑ دوں گا۔ پتا نہیں میرے بیان سے اس کی تشفی ہوئی یا نہیں البتہ اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ جب وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو اچانک اس نے اپنے بیٹے کو مارنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ باآواز بلند چلاتی بھی جارہی تھی۔

''گلزارو! یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تو اس دن کریم مستری سے جھگڑا کر کے روتا ہوا ابا کے پاس نہ آتا تو تھانے دار علی نواز پر شک نہ کرتا۔ تمھیں کتنی بار منع کیا ہے یہ آوارہ گردی اور سائیکل چلانا چھوڑ دے مگر تو سنتا ہی کہاں ہے۔''

گلزار نے بے خبری میں ایک آدھ تھپڑ ہی کھایا ہوگا۔ اس کے بعد وہ ماں کے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ بہت ہی چلتا پرزہ قسم کا لڑکا تھا۔ اس نے صغراں کو غچا دیا اور پلک جھپکتے میں یہ جا اور وہ جا! صغراں خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی۔

''میں بھی کیا کروں۔ اس کو بگاڑا بھی تو باپ ہی نے ہے۔ بچے کی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کر دیں تو پھر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ میں علی نواز کو سمجھاتی تھی' اس کی غلط باتوں کی حمایت نہ کر لیکن باپ میری سنتا ہے اور نہ ہی بیٹا۔ میں تو دونوں طرف سے ماری گئی نا......''

تھانے کے برآمدے سے گزرنے کے بعد جب صغراں صحن میں پہنچی تو ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس دوران میں' میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے کے دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ علی نواز کتنا قصوروار تھا' اس کو میں دیکھ ہی لیتا' صغراں کو تھانے میں روک کر خواہ مخواہ پریشان کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے عابدہ اپنے چھوٹے بیٹے نوید کے ساتھ میرے پاس آئی۔ نوید کی عمر سات سال تھی اور وہ اوپر تلے چھ بہنوں سے چھوٹا تھا۔ میں نے عابدہ کے بارے میں سنا تو فوری طور پر اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''مجھے پتا چلا ہے جی آپ نے کریم کے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا۔

''میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بتایا'' میں نے شربت والے علی نواز کو حراست میں لیا ہے وہ قاتل ہے یا نہیں اس بات کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ تفتیش جاری ہے۔''

وہ قدرے مایوس ہو گئی۔ اس کی مایوسی کو دیکھ کر مجھے بھی بڑا دکھ ہوا۔

''تھانے دار جی!'' وہ گلوگیر آواز میں بولی ''میرا جوان جہان بیٹا گھر سے چلا گیا۔ دو ہفتے گزر گئے۔ اب تک اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔'' اس کی آواز میں درد بڑھتا چلا گیا ''کریم کے قتل نے تو ہمارا کباڑا ہی کر ڈالا ہے۔ پہلے ہی گھر میں کون سی خوش حالی تھی۔ ایک کمانے والا تھا وہ بھی چلا گیا۔ فاقوں کی نوبت آنے والی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر سوالیہ انداز میں بولی۔

''آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ میں کہاں جا کر اپنے دکھوں کو روؤں پچھلے تین دن سے یوسف بھی تیز بخار میں پڑا ہے۔ کل باپ کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے اٹھا تھا اس کے بعد پھر چارپائی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ تو اس حالت میں بھی دکان کھولنے کو کہہ رہا تھا لیکن دکان پر تو آپ نے سرکاری تالا ڈالا ہوا ہے۔''

میں نے چونک کر عابدہ کو دیکھا اور مجھے قدرے شرمندگی بھی ہوئی۔ جائے وقوعہ والے کمرے کے دروازے پر میں نے ہی تالا لگوایا تھا۔ یہ ایک ضروری قانونی کارروائی تھی۔ بہر حال میں نے عابدہ سے کہا۔

''تالا تو میں کھلوا دوں گا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں لیکن پھر بھی یوسف کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ اگر بخار کی حالت میں وہ کام میں جت گیا تو کوئی اور ہی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے!''

''فاقے سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہوتی تھانے دار صاحب!'' عابدہ نے جگر پاش لہجے میں کہا ''زندہ رہنے کے لیے پیٹ روٹی مانگتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ نوالہ منہ تک پہنچانے والے ہاتھ حالات کے کس کس ستم کا شکار ہیں۔ یہ ہر حال میں ایندھن مانگتا ہے تاکہ اس جہنم کی آگ روشن رہے!''

وہ ایک ایسی سفاک حقیقت بیان کر رہی تھی جس سے کوئی بھی ذی ہوش شخص انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کے گھریلو حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میں نے اس کے رستے ہوئے زخموں پر ہمدردی اور خلوص کا مرہم رکھتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو عابدہ! انشا اللہ تمہارے گھر میں فاقوں کی نوبت نہیں آئے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا فی الحال میں اپنی جیب سے تمہاری مالی مدد کر دیتا ہوں۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور بیس روپے گن کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے بے یقینی سے میری جانب دیکھا لیکن رقم لینے کے لیے اس کا ہاتھ آگے نہیں بڑھا۔ میں نے اس کی ہچکچاہٹ کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔

''یہ رقم ادھار سمجھ کر رکھ لو۔ جب تمہارے ہاتھ میں پیسے ہوں گے تو واپس لوٹا دینا......اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یک

مشت ہی لوٹاؤ۔ تم اپنی سہولت کو دیکھتے ہوئے قسطوں میں بھی دے سکتی ہو۔ برا وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔ تمہارے اچھے دن بھی آئیں گے۔ یوسف باپ کی موت کے صدمے سے سنبھل جائے تو اس کا بخار وخار جاتا رہے گا۔ کام میں اس کا جی لگے گا تو گھر میں پیسے بھی آنے لگیں گے۔ تم اپنے حوصلے کو تھام کر رکھو۔ اگر تم نے ہی ہمت ہار دی تو بچوں کا کیا ہوگا۔ اب تم ہی ان کی ماں بھی ہو اور باپ بھی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''یہ رقم رکھ لو۔'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔

اس زمانے میں بیس روپے ایک معنی رکھتے تھے۔ ایک متوسط گھر کا مہینے بھر کا راشن زیادہ سے زیادہ پچیس روپے میں بہ آسانی آجاتا تھا۔ اس قلیل رقم کو آج کل کے تین ہزار روپے تصور کرلیں۔ میرے بٹوے میں اتنی ہی گنجائش تھی ورنہ شاید میں کچھ زیادہ دیتا!

عابدہ کا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے بیس روپے کے نوٹ تھام لیے پھر جذبات سے لبریز آواز میں بولی ''بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہیں۔''

''تم مجھے انسان ہی رہنے دو تو اچھا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''اور یہ احسان والی کیا بات کی ہے تم نے؟ میں نے یہ رقم تمہیں ادھار دی ہے۔ تمہیں یہ بیس روپے واپس کرنا ہیں مجھے!'' میں نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے اس کے اطمینان کی خاطر کہا۔

''وقت پڑنے پر تو قرض بھی خوش نصیبوں ہی کو ملتا ہے۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

''چلو اسی بہانے تمہارا اشمار خوش نصیبوں میں تو ہوا!'' میں نے کہا۔

اس کے آنسو نکل آئے اور وہ اپنے دوپٹے میں منہ دے کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ یہ رونا اس کے لیے مفید تھا۔ وہ پتا نہیں کتنے طوفانوں کا غبار اپنے سینے میں دبائے بیٹھی تھی۔ یہ غبار اگر آنسو بن کر آنکھوں کے راستے نکل جاتا تو وہ ہلکی پھلکی ہو جاتی۔ تاریکی کے دامن ہی سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے۔ دکھوں کا حد سے بڑھ جانا تو خوشی کی نوید ہوتا ہے' سکھ کا پیامبر ہوتا ہے!

دس پندرہ منٹ بعد اس نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے اس دوران میں ہمدردی کا ایک بول نہیں بولا تھا۔ اسے کوئی تسلی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خاموش بیٹھا اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا تھا کیونکہ یہی اس کے مرض کا علاج تھا' اس کے درد کا مداوا تھا۔ وہ اپنی مدد آپ کے تحت سنبھلی تھی لہٰذا مجھے امید تھی' اس کا یہ سنبھلنا پائیدار ثابت ہوگا! رات کو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگا تو حوالدار شیر علی کمرے میں چلا آیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے مجھے صرف آج کے دن کی مہلت دی تھی اس لیے میری ''تحقیقاتی'' رپورٹ حاضر ہے۔''

میں دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھا اور پوری توجہ حوالدار پر مرکوز کردی۔

وہ بتانے لگا ''ملک صاحب! میں نے اس بندے پر ہر قسم کی سختی کر کے دیکھ لی مگر اس نے کوئی جرم قبول نہیں کیا۔ میں نے فنگر پرنٹس والا ٹوٹکا بھی آزمایا ہے۔ اس کی انگلیوں کے نشانات لینے کے بعد میں نے ایک گھنٹے تک اسے ''آزاد'' چھوڑ دیا اور اس کے بعد جا کر بتایا کہ ہوا بھرنے والے پمپ پر جو فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں وہ اس کی انگلیوں کے حاصل کردہ نشانات سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ اپنی ضد پر ڈٹا ہوا ہے۔'' حوالدار نے جواب دیا ''وہ کہتا ہے اس نے مستری کریم کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ہوا بھرنے والے کسی پمپ کو چھوا ہے لہٰذا وہاں اس کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا ممکن نہیں۔ میں جھوٹ بول کر اسے قتل کے کیس میں ملوث کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس والے اپنی نااہلی اور ناکامی.... کو چھپانے کے لیے اسی قسم کے اوچھے ہتھکنڈے اپنا کر بے گناہوں کو پھانس لیتے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''شیر علی! کیا تم نے اس کی یہ لمبی چوڑی تقریر سن لی؟''

''ہاں سن لی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''اور اس کے بدلے میں اسے بھی مجھ سے بہت کچھ سننے کو ملا ہے...... منہ کی زبان سے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں کی زبان سے۔'' اتنا کہہ کر وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ اس کے چہرے پر بڑے معنی خیز تاثرات سجے تھے۔ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''ویسے ملک صاحب! یہ بندہ ہے بہت ہی سخت جان۔ میں نے علی نواز کو جس نوعیت کی تفتیش سے گزارا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی چیں بول جاتی۔ یہ مسلسل میری خاطر

تواضع سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اس کی زبان پر ایک ہی تکرار رہی کہ ہم غلط رخ پر تفتیش کر رہے ہیں' ہمیں کسی اور انداز میں بھی کوشش کرنا چاہیے۔''

میں نے حوالدار کے خاموش ہونے پر کہا ''تم نے پوچھا نہیں اور کس انداز میں؟''

''پوچھا تھا...... اور اس نے بتایا بھی ہے۔'' وہ بڑی رسان سے بولا ''کہتا ہے ہم نے اب تک مقتول کے بیٹے کو کیوں نظرانداز کیا ہوا ہے۔''

''بیٹے کو!'' میں اچھل پڑا'' وہ کس بیٹے کی بات کر رہا ہے؟''

''فاروق کی۔'' حوالدار نے جواب دیا ''اس کا کہنا ہے فاروق اور کریم میں ایک ذرا نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ فاروق کافی دنوں سے گھر سے غائب ہے اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ سرا ہاتھ نہیں لگا۔ وہ جس صبح غائب ہوا اس سے پچھلی رات ان کے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ بھی ہوا تھا اور...... دونوں باپ بیٹے میں ہاتھا پائی کی نوبت بھی آ گئی تھی۔ عین ممکن ہے فاروق ہی نے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔''

علی نواز بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ فاروق چار مئی کی صبح کو گھر سے نکلا ہوا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا اور آج اٹھارہ مئی کا دن بھی اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ عابدہ کی زبانی مجھے اس گھر کے حالات سے پوری واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔ علی نواز نے جس نکتے کو اٹھانے کی کوشش کی تھی وہ واقعی اپنے اندر بڑی توانائی رکھتا تھا۔ علی نواز کی بات سے یہ بھی واضح ہوا کہ مقتول کریم کے گھریلو حالات سے کم و بیش قصبے کے تمام افراد آگاہ تھے۔

تین مئی کی رات مقتول کریم کے گھر میں ٹھیک ٹھاک ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مقتول نے اپنی بیوی عابدہ کو بے دریغ زدوکوب کیا تو فاروق کو بھی طیش آ گیا۔ وہ ماں کا حمایتی بن کر باپ کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا یہ عمل عین فطری اور برمحل تھا۔

علی نواز نے میرے ذہن کو جونئی راہ دکھائی میں اسے نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا' فاروق ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت گھر سے فرار ہو گیا ہو اور پھر موقع پا کر اس نے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا...... اور ایک مرتبہ پھر اسی انداز میں غائب ہو گیا جیسے پہلے ہوا تھا۔

محبت اور نفرت دو طاقتور جذبات ہیں' فرق تعمیری اور تخریبی کا ہے۔ محبت قربانی اور ایثار کا درس دیتی ہے۔ محبت کرنے والے دوسروں کی خاطر اپنی جان نچھاور کر دیتے ہیں جب کہ نفرت سراسر تخریبی عمل کا نام ہے۔ نفرت میں انسان جان لینے سے ذرا دریغ نہیں کرتا۔ فاروق اور کریم ایک دوسرے سے جس درجہ نفرت کرتے تھے اس میں کوئی بھی دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ سکتا تھا!

اب مسئلہ یہ تھا کہ فاروق کو کہاں تلاش کیا جاتا۔ جب تک وہ ہاتھ نہ آتا اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا تھا۔ میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ حوالدار شیر علی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب!''

میں نے ٹھہری ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھ لیا ''تم نے علی نواز کے بارے میں کیا اندازہ لگایا ہے؟''

''اب تک کی تفتیش سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' اس نے کریم کا قتل نہیں کیا۔'' حوالدار نے گہری سنجیدگی سے کہا ''آپ نے مجھے آج کے دن کی مہلت دی تھی' یہ اس دن کی رپورٹ ہے۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''اس نیک کام کے لیے میں تمہیں آج کی رات بھی دیتا ہوں۔ صبح علی نواز کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔''

اس کی آنکھوں میں ایک پرمسرت سی چمک نمودار ہوئی۔ جب بھی کسی ملزم کو حوالدار یا متعلقہ تفتیشی عملے کے سپرد کیا جاتا ہے تو ان کی خوشی قابل دید ہوتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی انمول خزانہ ان کے ہاتھ لگنے والا ہو!

حوالدار نے پراعتماد انداز میں کہا ''ملک صاحب! انشاء اللہ صبح تک ''کٹی کٹے'' کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ ویسے......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''ویسے ہمیں علی نواز کی بات پر بھی ضرور غور کرنا چاہیے...... وہی فاروق والی بات!''

''ہاں ہاں فاروق کو بھی دیکھ لیں گے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔

اس رات سونے سے پہلے میں کافی دیر تک فاروق کے بارے میں سوچتا رہا اور یہی فیصلہ کر کے سویا کہ اگلی صبح میں فاروق کی تلاش میں اور زیادہ سرگرمی پیدا کر دوں گا۔

☆☆☆

کہتے ہیں' ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے کہ انسان آگ کی

تلاش میں نکلنے اور اسے پیا مبری مل جائے۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی خوش گوار اتفاق پیش آ گیا۔ اس قدرت والے نے ایک ایسی راہ دکھادی کہ میرا کام آسان ہو گیا۔

دوسری صبح میں نے فاروق کی تلاش کے ''بندوبست'' کا ازسرنو جائزہ لیا اور کارروائی میں تیزی لانے کے لیے اپنے عملے کے مزید تین چار افراد کو ہائی الرٹ کر کے مختلف محاذوں پر دوڑا دیا۔ جب گیارہ بجے میں واپس تھانے آیا تو ایک خوشخبری میری منتظر بیٹھی تھی۔ یہ خوشخبری فاروق کی صورت میں تھی۔ وہ دو پولیس والوں کے ساتھ تھانے میں موجود تھا۔ میں نے ان تینوں کو فی الفور اپنے کمرے میں بلالیا۔

پولیس والوں میں ایک اے ایس آئی اور دوسرا کانسٹیبل تھا۔ ان دونوں کا تعلق لاہور پولیس سے تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اے ایس آئی نے بتایا۔

''ملک صاحب! اس جوان کو ہم نے شاہی محلے کے ایک کوٹھے سے گرفتار کیا ہے۔''

''اوئے بدبخت!'' میں نے فاروق کو کھا جانے والی نظر سے گھورا ''تو ادھر ہیرامنڈی میں کیا لینے گیا تھا؟ ادھر تیری ماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا اور تیرا باپ......!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا تو وہ جلدی سے بولا ''کیا ہوا میرے ابا کو؟''

''یہ بھی مجھ ہی سے پوچھو گے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ آنے والے اے ایس آئی نے کہا ''ملک صاحب! ہمیں واپس جانے کی جلدی ہے اس لیے آپ پہلے ہماری سن لیں۔ اس کی چمڑی بعد میں بڑی تسلی سے ادھیڑتے رہیں۔ ہم اسے آپ کے حوالے کر کے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا ''اس کے بارے میں کیا تفصیلات ہیں؟''

ایک بات کا تو مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ لاہور سے آنے والے پولیس والے یہاں کے حالات سے قطعی ناواقف تھے یعنی فاروق نے اس سلسلے میں ان کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ یا تو وہ اپنے باپ کے قتل میں ملوث ہی نہیں اور یا پھر بہت مضبوط ہے اس کے دل کا حال جاننا آسان نہیں۔ اس نے اپنے کارنامے کو بڑی ہوشیاری سے چھپا رکھا ہے۔

مہمان اے ایس آئی نے مجھے بتایا کہ فاروق کو کل رات گرفتار کیا گیا تھا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ مذکورہ کوٹھے پر ایک مفرور مجرم کی آمد متوقع ہے۔ انہوں نے بڑی رازداری سے اس کوٹھے پر چھاپا مارا مگر مذکورہ مجرم کی گرفتاری میں انہیں ناکامی... کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہی سوچا جا رہا تھا کہ پولیس کو مطلوب وہ مفرور مجرم اس رات کوٹھے پر آیا ہی نہیں تھا یا پھر چھاپے کی بھنک اسے مل گئی اور پولیس کی آمد سے پہلے ہی وہ موقع سے فرار ہو گیا۔ بہرحال پولیس نے کوٹھے پر موجود تماش بینوں کو گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا۔

فاروق کے سوا باقی تمام تماش بینوں کا تعلق لاہور ہی سے تھا۔ رات بھر کی تفتیش نے فاروق کو غیر متعلق اور بےضرر ثابت کر دیا تو متعلقہ تھانے کے عملے کے دو افراد اسے میرے پاس پہنچانے اس قصبے تک چلے آئے تھے۔ وہ بھلا زمانہ تھا اور عوام کو بلاوجہ پریشان نہیں کیا جاتا تھا ورنہ اگر فاروق کسی ایسے ویسے پولیس والے کے ہتھے چڑھا ہوتا تو وہ اپنی پیدا کے ساتھ ساتھ اس کے والی وارثوں کی بھی ناک سے لکیریں نکلوا دیتا۔

لاہور پولیس والے فاروق کو میرے حوالے کر کے تھانے سے رخصت ہو گئے تو اس نے اپنا سوال ایک مرتبہ پھر دہرا دیا ''میرے ابا کو کیا ہو گیا ہے؟''

''تمہارے ابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے براہِ راست سنگین لہجے میں کہا ''اور مجھے تم پر شک ہے۔''

اپنے باپ کے قتل کی خبر سن کر وہ اتنا پریشان نہیں ہوا جتنا میرے شک نے اسے ہراساں کر دیا۔ حیرت بھرے لہجے میں بولا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟''

''میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم نے سنا ہے۔''

''مم......مگر میں اپنے باپ کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔'' وہ سخت فکرمند تھا۔

میں نے کہا ''اس کی کھوپڑی پر سائیکل میں ہوا بھرنے والا پمپ برسا کر......اور اس کی گردن میں سائیکل کی ٹیوب کا پھندا لگا کر......اس طرح؟''

''پتا نہیں آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ احتجاجی لہجے میں چلایا۔

''سب پتا چل جائے گا!'' میں مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

وہ بولا ''میں تو پندرہ سولہ دن پہلے گھر سے نکل گیا تھا۔ مجھے کیا پتا ابا کے ساتھ پیچھے کیا واقعات پیش آئے ہیں۔'' پھر پوچھنے لگا ''ابا کو کب قتل کیا گیا ہے؟''

''پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان۔''

''اوہ!'' اس نے تاسف بھری سانس خارج کی اور

بولا ''مجھے ابا کی موت کا بہت افسوس ہے لیکن ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ میں پندرہ مئی کو اس قصبے میں تھا ہی نہیں پھر قتل کی کسی واردات میں کیسے ملوث ہوسکتا ہوں؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''یہ ٹھیک ہے کہ حالات وواقعات کے مطابق تم چار مئی کی صبح سے غائب ہو اور اب لاہور پولیس کے دو اہلکار تمہیں پکڑ کر یہاں پہنچا گئے ہیں' تمہاری گرفتاری اور تفتیش کی تفصیل بھی انہوں نے بیان کردی لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ تم نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا۔ عین ممکن ہے اس دوران میں پندرہ مئی کی شام تم اپنے باپ کی دکان پر پہنچے ہو اور اسے بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار کر واپس چلے گئے ہو!''

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکنے لگا پھر احتجاجی لہجے میں بولا ''آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے مجھ پر ایک گھناؤنا الزام ہے۔ میں بھلا اپنے باپ کو کیوں قتل کروں گا۔''

''تمہارے پاس اپنے باپ کو قتل کرنے کی ٹھوس وجوہات ہیں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا ''مثلاً کون سی وجوہات؟''

''تم اپنے باپ سے شدید نفرت کرتے ہو...... بلکہ کرتے تھے۔''

''یہ سچ ہے مجھے اپنے باپ سے نفرت تھی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''لیکن اس نفرت کے نتیجے میں' میں قتل ایسی سنگین واردات نہیں کرسکتا۔''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تفتیش کے بعد پتا چلے گا تم نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں کیا۔ نفرت اتنا طاقتور جذبہ ہے کہ اس سے مغلوب ہوکر انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔ تمہارا باپ مستری کریم بھی تمہیں سخت ناپسند کرتا تھا۔ اکثر وبیشتر وہ تمہیں برا بھلا سناتا رہتا تھا۔ وہ تمہاری آوارہ گردی اور نکمے پن سے عاجز تھا اور تمہاری شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم چار مئی کی صبح گھر سے ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا اور آج انیس مئی ہے۔ تمہاری ماں کی زبانی مجھے پتا چلا ہے تین مئی کی رات تم نے اپنے باپ سے ہاتھا پائی بھی کی تھی؟''

''ہاں کی تھی۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا ''ابا نے اماں پر زیادتی کی حد کردی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اماں

کو بچانے کے لیے بیچ میں کود پڑا تھا۔ ابا اس وقت جس بے رحمانہ سلوک سے اماں کو گزار رہا تھا۔ اس میں ہاتھا پائی تو ہونا ہی تھی۔ میں ابا کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر میں اتنی ہمت نہ کرتا تو ممکن تھا وہ سفاک شخص یعنی ابا میری اماں کو جان ہی سے مار دیتا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ کافی رنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس رنجیدگی کا تعلق باپ کے قتل سے تھا یا پھر ماں کے ساتھ ہونے والے اس رات کے وحشیانہ سلوک سے۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یوسف تم سے بڑا بھائی ہے۔ کیا وہ اس رات گھر پر موجود تھا جب مقتول کریم اپنی بیوی عابدہ کو زدوکوب کر رہا تھا؟''

''بالکل موجود تھا۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا' وہ اپنے بڑے بھائی یوسف کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا'' اس نے کہاں جانا تھا!''

''کیا یوسف نے ماں کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

''زبانی کلامی۔'' وہ بے پروائی سے بولا' یوسف ایک مٹی کا مادھو ہے۔ ابا کا بہت احترام کرتا ہے بلکہ آخری حد تک وہ ابا سے ڈرتا ہے۔ دور کھڑا زبان ہلا کر انہیں لڑائی جھگڑے سے منع کرتا رہا۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ آگے بڑھ کر ظالم باپ کا ہاتھ ہی روک لے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا'' یہ ہمت تم نے کر لی۔ ماں کے بچاؤ کے لیے تم نے باپ سے اچھی خاصی ہاتھا پائی کی کیوں کہ تم مٹی کا مادھو نہیں بلکہ آگ کا گولا ہو۔ تم باپ کا احترام کرتے ہو اور نہ ہی اس کی طرف سے تمہارے دل میں کوئی ڈر خوف تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''اس رات میں نے جو کچھ کیا وہ حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت تھا۔'' وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے جلدی سے کہا'' اور پندرہ مئی کی شام تم نے جو کچھ کیا وہ بھی تقاضائے حالات اور ضرورت وقت تھا؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

میں نے گمبیر انداز میں کہا'' اپنے باپ کا قتل!''

''آپ مجھ پر سراسر الزام لگا رہے ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔

''پھر بتاؤ تم پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان کہاں تھے؟'' میں نے درشت لہجے میں استفسار کیا'' یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتاؤ کہ چار مئی کی صبح سے لے کر ہازار حسن کے ایک کوٹھے پر پہنچنے تک تم نے کہاں کہاں اور کس طرح وقت گزارا۔ یہ لگ بھگ دو ہفتے یعنی پورے چودہ دن بنتے ہیں؟''

وہ چند لمحات تک خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر میرے سوالات کی روشنی میں گھر سے اپنے غیاب کی تفصیل بتانے لگا۔ میں اس کے پھیلے ہوئے قصے کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہو کر فاروق نے گھر چھوڑ دیا تھا اور میرا اندازہ بھی یہی تھا جن گھروں میں افراد خانہ اور وسائل کے بیچ توازن قائم نہیں رہتا وہاں ایسے ہی واقعات جنم لیتے ہیں۔ فاروق کے مطابق اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے قصبے سے چپ چپاتے نکلا اور خاموشی سے لاہور پہنچ گیا۔ اپنے اس اقدام کے بارے میں اس نے فرید' سلطان اور مطلوب کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بالکل ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں تھا لہٰذا مزدوری ہی روزگار کا وسیلہ بنی۔ وہ سبزی منڈی میں سبزی اور پھلوں کے ٹوکرے اٹھانے لگا۔ پھر اس کی ملاقات قدیر نامی ایک شخص سے ہو گئی۔ قدیر اکبری منڈی میں پلے داری کرتا تھا۔ ان میں جلد ہی دوستی ہو گئی اور قدیر نے فاروق کو بھی اپنے ساتھ اکبری منڈی میں کام پر لگا لیا۔ قدیر کی رہائش گوال منڈی کے علاقے میں تھی۔ فاروق بھی اس کے ساتھ رہنے لگا۔ صحبت سے انسان یقیناً بہت کچھ سیکھتا ہے۔ قدیر کو اس بازار میں جانے کا شوق تھا' فاروق بھی اس شوق میں گرفتار ہو گیا اور پھر بالآخر اٹھارہ مئی کی رات پولیس کی چھاپا مار کارروائی میں گرفتار ہو کر وہ حوالات میں چلا گیا اور اب...... انیس مئی کی دوپہر میں وہ میرے سامنے بیٹھا اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''اوئے بدبخت! کیا تم نے لاہور کی منڈیوں کو ٹھیکا لے رکھا تھا۔ سبزی منڈی' اکبری منڈی' گوال منڈی اور پھر ہیرا منڈی ...... اگر تم کچھ عرصہ اور وہاں تک جاتے تو چونا منڈی' لکڑ منڈی' سوتر منڈی' پان منڈی اور پتا نہیں کون کون سی منڈیوں کا پھیرا لگا لیتے؟''

''جناب! جو حقیقت تھی وہ میں نے بتا دی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا'' اب آپ کی مرضی ہے یقین کریں یا نہ کریں۔''

''اوئے یقین کے گھوڑے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا'' ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ پندرہ مئی کی

شام چھ اور سات بجے کے درمیان تم کس منڈی کے کون سے کونے میں موجود تھے؟''

وہ چند لمحے خاموش رہ کر ذہن میں کچھ حساب جوڑتا رہا پھر جواب دیا ''جناب! مجھے یاد آ گیا پندرہ مئی کی شام ہم نے اکبری منڈی سے ذرا جلدی چھٹی کر لی تھی اور دونوں فلم دیکھنے چلے گئے تھے۔''

''فلم دیکھنے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں گھورا ''کون سا شو؟''

''چھ سے نو والا۔'' اس نے بتایا۔

اگر واقعی انہوں نے لاہور کے کسی سینما میں چھ سے نو والا فلم شو دیکھا تھا تو پھر فاروق کی ذات کریم مرڈر کیس سے مبرا ہو جاتی تھی لیکن میں اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم دونوں نے کس سینما میں کون سی فلم دیکھی تھی؟''

اس نے بتایا ''ہم نے اکمل اور فردوس کی فلم ''ملنگی'' دیکھی تھی۔ آج کل یہ فلم ادھر لاہور میں میکلوڈ روڈ کے ایک سینما میں لگی ہوئی ہے۔''

''سینما کا نام بھی بتاؤ۔''

''اتن۔''

''یہ مت سمجھنا میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات کا یقین کر لوں گا۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ''میں تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے ابھی ایک بندہ لاہور دوڑاؤں گا۔ وہ سیدھا قدیر کے پاس پہنچے گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

''یہ آپ مجھ پر بہت بڑا احسان کریں گے۔'' وہ منت زیر لہجے میں بولا۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کی تصدیق سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ اس مصیبت سے میری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ کی نظر میں' میں بے قصور ثابت ہو جاؤں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ ٹھیک ہے ابا اور میں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے مگر اس کو قتل کرنے کے بارے میں' میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا ہوتا تو گھر میں رہتے ہوئے بھی میں یہ کام کر سکتا تھا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی میں ایک

ٹھہراؤ پنہاں تھا۔ ایسا ٹھہراؤ اور ثبات جو سچائی کا قریبی رشتے دار ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ مبنی بر حقیقت ہو۔ میں چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے سے دیکھتا رہا پھر کہا۔

''جب تک مجھے تمہاری بے گناہی اور اس کیس سے لاتعلقی کا یقین نہیں ہو جاتا تمہیں تھانے میں رہنا ہوگا۔''

''یہ تو بہت زیادتی ہوگی جناب۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا میں کیوں خواہ مخواہ آپ کے تھانے کی حوالات میں بند رہوں؟''

''میں نے حوالات میں بند کرنے والی کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''تم تھانے میں رہو گے اور بڑے آرام سے رہو گے۔ بس اتنا سمجھ لو اس دوران میں تمہیں کوئی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے فاروق کو حوالدار شیر علی کے حوالے کرنے سے پہلے اسے خصوصی ہدایت کر دی کہ تفتیش کے نام پر اس سے کوئی زیادتی نہ کرے۔ پیار محبت سے بہلا پھسلا کر اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک تجربہ کار اور ہوشیار قسم کے کانسٹیبل کو لاہور روانہ کر دیا تاکہ قدیر سے مل کر وہ فاروق کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ اگر لاہور سے یہ ثابت ہو جاتی کہ فاروق نے اس سلسلے میں کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے تو سچ کا اعتراف کروانے کے لیے میں اس کی چمڑی بھی ادھیڑ سکتا تھا..... خواہ مخواہ اس پر سختی کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

میں اس روز تھانے میں اس قدر مصروف رہا کہ دوپہر کا کھانا بہت دیر سے کھانا نصیب ہوا۔ گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے کھانے کے بعد نیند ضرور حملہ آور ہوتی ہے اور اگر کھانا تاخیر سے کھایا جائے تو یہ حملہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ میں دن بھر موسم کی شدت سے نبرد آزما افراد کی مصروفیات کے حوالے سے بات کر رہا ہوں ورنہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ائرکنڈیشنڈ دفاتر میں دن گزارنے والے افراد بھی اسی درجے کی نیند محسوس کریں جہاں دن میں کئی مرتبہ چائے کا دور بھی چلتا ہے۔ بس اپنے اپنے مقام کی بات ہے!

بہرحال سہ پہر چار بجے کے قریب جب میں ذرا فارغ ہوا اور نیند نے مجھے پچھاڑنے کے لیے زور مارنا شروع کیا تو میں نے اے ایس آئی جلال دین سے کہا کہ میں تھوڑی دیر تک کمر سیدھی اور آنکھیں ہلکی کرنے اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ اس دوران میں وہ تھانے کے اندرونی معاملات پر گہری نظر رکھے۔ اے ایس آئی نے مجھے ایسا کرنے کا یقین دلایا تو میں اپنے کمرے سے نکل آیا..... لیکن مجھے اپنے کوارٹر تک پہنچنا نصیب نہ ہوا۔

میں جیسے ہی کمرے سے نکل کر تھانے کے احاطے میں پہنچا، عابدہ اپنے بڑے بیٹے یوسف کے ساتھ تھانے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔

میں یہی سمجھا کہ اسے کہیں سے فاروق کی سن گن مل گئی ہے اور وہ اپنے گم شدہ بیٹے کو ''وصول'' کرنے تھانے آئی ہے لیکن جب اس سے بات ہوئی تو یہ اور ہی معاملہ نکل آیا۔

''تھانے دار صاحب! میں ایک بہت ہی ضروری مسئلے پر بات کرنے آئی ہوں۔'' وہ فکرمند لہجے میں بولی ''آپ ذرا اپنے کمرے میں آجائیں۔''

اس کا انداز یہی ظاہر کرتا تھا وہ تھانے میں فاروق کی موجودگی سے مطلق بے خبر ہے۔ میں ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آبیٹھا۔

''ہاں بتاؤ کیا ضروری بات کرنے آئی ہو؟'' میں نے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے جواب دینے سے قبل ایک مرتبہ متفکر نظر سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ عابدہ مجھے جو کچھ بھی بتانے آئی ہے اس کا تعلق یوسف سے ہے۔ میرا یہ اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں بولی۔

''یوسف! تم تھانیدار صاحب کو اپنے خواب کے بارے میں خود ہی بتادو۔''

''خواب!'' میں نے چونک کر باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

''جی تھانے دار صاحب!'' عابدہ بولی ''یوسف نے ایک بڑا خطرناک خواب دیکھا ہے۔''

میں پوری طرح یوسف کی جانب متوجہ ہو گیا ''ہاں بھئی یوسف! تم نے کب اور کیسا خواب دیکھ لیا؟''

''جناب! میں دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا تھا۔'' وہ نگاہ نیچی رکھتے ہوئے بولا ''میری آنکھ لگ گئی اور پھر میں نے وہ ڈراؤنا خواب دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔''

''خوابوں کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں تاہم میں نے یہ سن رکھا تھا دن کے وقت نظر آنے والے خواب عموماً سچے نہیں ہوتے۔ اسی تناظر میں، میں نے یوسف سے کہا۔

''اللہ کے بندے! دن میں تو انسان اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا ہے۔ بہرحال بتاؤ تم نے کون سا ڈراؤنا خواب دیکھ

لیا۔''

کوئی ایسا ویسا خواب دیکھ کر تھانے دوڑے آنا بڑی عجیب سی بات تھی تاہم میں نے ان دونوں کے لیے اپنے رویے میں کیسی قسم کی سختی شامل نہیں کی۔ وہ ایک مصیبت زدہ خاندان کے دو اہم افراد تھے۔ وہ اپنی پریشانی میں کوئی بھی حرکت کر سکتے تھے۔ پریشان ذہن ہمیشہ پریشان کن خواب دیکھتا ہے۔

اس نے جواب میں بتایا'' جناب! میں نے خواب میں دیکھا ہے ہماری دکان میں چوری ہوگئی ہے۔''

میں ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے تکنے لگا۔ پچھلے چند روز سے وہ بخار میں مبتلا تھا۔ بیمار اور فکر مند ذہن نے پتا نہیں اسے کیا دکھا دیا تھا میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

'' کیا تم اسی دکان کی بات کر رہے ہو جس کے دروازے پر میں نے سرکاری تالا ڈال رکھا ہے؟''

'' جی...... جی ہاں وہی۔'' وہ جلدی سے بولا'' ہماری ایک ہی تو دکان ہے۔''

'' تم نے خواب میں کس قسم کی چوری دیکھی ہے۔'' میں نے استفسار کیا'' کیا چور نے دکان کا دروازہ توڑا ہے؟ اس دکان میں تو میں نے سائیکل مرمت کا سامان اور چند سائیکلیں رکھی دیکھی تھیں۔ چور کون ہے اور اس نے وہاں سے کیا کیا چرایا ہے؟''

وہ گھبرا کر میری طرف دیکھنے لگا'' جناب! اتنے سارے سوالات کے جواب میں کیسے دے سکتا ہوں؟''

'' بھئی! خواب تم نے دیکھا ہے اس لیے جواب بھی تم ہی دو گے!''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا'' تھانے دار صاحب! میں نہیں جانتا چور نے ہماری دکان سے کیا کیا چرایا ہے اور نہ ہی مجھے یہ پتا ہے کہ اس نے دکان کا دروازہ بھی توڑا ہے یا نہیں۔''

اس کا انداز خاصا الجھا ہوا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

'' پھر تم کس بنا پر کہہ رہے ہو کہ تمہاری دکان میں چوری ہوئی ہے؟''

وہ متذبذب انداز میں بولا'' جناب! اس دکان کی پچھواڑے والی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے۔ یہ کھڑکی ہوا کی آمد و رفت کے لیے رکھی گئی ہے۔ جب تک دکان کھلی رہتی ہے ہم اس کھڑکی کو کھول کر رکھتے ہیں اور دکان بند کرتے وقت اسے بھی بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی جاتی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

'' تھانے دار صاحب! میں نے خواب میں وہ کھڑکی کھلی ہوئی دیکھی ہے۔''

عابدہ اس کے بیان کی حمایت میں بولی'' جناب! میں نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے اگر خواب میں کسی بند گھر کا دروازہ یا کھڑکی وغیرہ کھلی دیکھو تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہاں چوری ہوگی۔''

میں خواب اور اس کی تعبیر کے حوالے سے بحث کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا لہٰذا گفتگو کو موضوع کی معقولیت تک رکھتے ہوئے ان سے پوچھا۔ میرا مخاطب دراصل یوسف تھا۔

'' کیا تم خواب دیکھنے کے بعد سیدھا تھانے دوڑے آئے ہو یا دکان جا کر اس کی تصدیق بھی کی ہے؟''

یوسف کے بجائے عابدہ نے جواب دیا'' ہم تو سیدھے آپ ہی کے پاس آئے ہیں۔''

اس کی بے وقوفی نما سادگی دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا تاہم میں نے کسی قسم کی سرزنش کرنے کے بجائے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

'' ٹھیک ہے میں ابھی تم لوگوں کے ساتھ لاری اڈے چلتا ہوں۔ دکان کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوگا کہ وہاں کس نوعیت کی چوری ہوئی ہے!'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا'' ویسے تم لوگوں کے لیے میرے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔''

انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا اور یکے بعد دیگرے بولے'' کیسی خوش خبری؟''

'' فاروق واپس آگیا ہے۔'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

'' کیا؟'' عابدہ اچھل پڑی۔ اس کے اچھلنے میں ماما کی تڑپ شامل تھی'' کہاں ہے میرا بیٹا؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔

'' فاروق کہاں سے ملا تھانیدار صاحب؟'' یوسف نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا'' وہ کہاں گیا تھا' کیوں گیا تھا' واپس کیوں اور کیسے آیا اور اس وقت کہاں ہے...... ان تمام سوالات کے جواب میں آپ لوگوں کو بعد میں دوں گا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ وہ صحیح سلامت میری تحویل میں ہے۔ فی الحال ہم لاری اڈے جا رہے ہیں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

میرا یہ فیصلہ یوسف کے خواب کا رہین منت نہیں تھا بلکہ

میں اس دکان پر ڈلا ہوا سرکاری تالا کھول کر دکان یوسف کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ کام دھندے پر توجہ دے سکے۔ اس طرح اس کا دھیان بھی بٹ جاتا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بخار والی لپیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ فاروق والے معاملے کو میں نے دانستہ ان سے چھپایا تھا...... اور یہ چھپانا تھوڑی دیر کے لیے تھا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور عابدہ و یوسف کی ہمراہی میں لاری اڈے پہنچ گیا۔ مقتول مستری کریم کی سائیکلوں والی دکان لاری اڈے پر ہی تھی چنانچہ اس تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہ لگی۔

دکان کا دروازہ بند اور اس پر سرکاری تالا موجود تھا۔ میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور دکان کی عقبی جانب بڑھ گیا۔ وہ تینوں بھی میرے پیچھے لپک آئے۔

دکان کے عقبی دیوار میں موجود کھڑکی واقعی کھلی ہوئی تھی۔ یوسف جوشیلے لہجے میں بولا "دیکھ لیں تھانے دار صاحب! میرا خواب جھوٹا نہیں۔ میں نے یہی کھڑکی بالکل ایسے ہی کھلی دیکھی تھی۔"

"اللہ خیر کرے۔" عابدہ کے منہ سے تشویش بھرا جملہ خارج ہوا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے یوسف کے جواب میں کہا اور کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ ڈیڑھ ضرب دو فٹ کی ایک پٹ والی چوبی کھڑکی تھی جس کا اکلوتا پٹ، چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ کھڑکی کے درے میں کسی قسم کی کوئی آہنی سلاخ نصب نہیں تھی۔ وہ سیدھا سادہ ایک چوبی فریم تھا جہاں سے کوئی بھی بندہ تھوڑی کوشش کر کے اندر باہر آ جا سکتا تھا۔ زمین سے کھڑکی کی اونچائی لگ بھگ پانچ فٹ رہی ہوگی۔

مجھے یاد آیا جب پندرہ مئی کی رات میں وقوعہ کی کارروائی نمٹا رہا تھا مذکورہ دکان کے اندر عقبی دیوار میں، میں نے یہ کھڑکی دیکھی تھی لیکن اس وقت کھڑکی بند تھی۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ اس وقت کھڑکی کی کنڈی اندر سے لگائی جا چکی تھی یا نہیں۔ میں نے کھڑکی کا پٹ بند دیکھا تھا۔ اس کی کنڈی کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ اگر کھڑکی کی کنڈی لگنے سے رہ گئی تھی تو وہ ہوا کے باعث بھی کھل سکتی تھی اور اگر کنڈی کے باوجود بھی وہ کھل گئی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ کھڑکی کو زبردستی کھولا گیا تھا۔ یہ زبردستی دکان کے باہر سے کھڑکی پر کی گئی تھی۔ ایسی زبردستی کرنے والے کا یقیناً کوئی مقصد بھی رہا ہوگا۔ اگر یہ کارروائی چوری کی نیت سے کی گئی تھی تو دکان کھلنے پر ہی نقصان کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

میں کھڑکی کے نزدیک آ گیا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کھڑکی دکان کے اندر ہی سے کھولی اور بند کی جا سکتی تھی۔ اکلوتے پٹ کے ایک کونے پر اندر کی جانب ٹوٹی ہوئی کنڈی کے آثار نظر آ گئے۔ مذکورہ کنڈی پٹ کے اندرونی طرف نصب ہونے کے باعث پوری طرح دکھائی نہیں دے رہی تھی تاہم یہ اندازہ قائم کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ باہر سے قوت صرف کر کے اس کھڑکی کو کھولا گیا تھا۔

میں نے اس دکان کے اندر چار سائیکلیں، سائیکلوں سے متعلق اسپیئر پارٹس اور سائیکل کی مرمت والے اوزار ہی دیکھے تھے جن میں ہوا بھرنے والا وہ پمپ بھی شامل تھا جس کی "اچھوتی" ضرب نے مستری کریم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس تنگ سی کھڑکی کے راستے مختلف قسم کا ساز و سامان تو پار کیا جا سکتا تھا مگر پوری سائیکل کو نکال لے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں اس پراسرار اجنبی چور کے اغراض و مقاصد پر غور کرتے ہوئے دکان کے دروازے کی طرف چلا آیا۔

میرے حکم پر کانسٹیبل نے دکان کا تالا کھولا اور ہم سب دکان کے اندر پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر عروج پر تھی لہٰذا کھڑکی اور دروازہ کھل جانے کے باعث دکان میں اجالا بھر گیا۔ وہاں موجود ہر شے ہمیں نمایاں نظر آنے لگی۔

میں نے ایک لمحے میں طائرانہ نگاہ دوڑا کر یہ اندازہ لگا لیا کہ وہاں کسی قسم کی کوئی چوری نہیں ہوئی تھی البتہ وہاں موجود چیزوں کی ترتیب وغیرہ میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ اشیا کو اِدھر اُدھر کر کے اس کی جگہ بدل دی گئی ہو۔ سائیکلیں چاروں کی چاروں موجود تھیں تاہم وہ ایک دوسرے کے اوپر لیٹی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دھکا دے کر انہیں گرایا گیا ہو۔ جب کہ پندرہ مئی کی رات میں نے وقوعہ پر انہیں ترتیب وار ایک قطار میں کھڑے دیکھا تھا۔ آثار سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ دکان کے اندر داخل ہونے والے متوقع اور مبینہ "چور" کا ہاتھ ایک سائیکل کو لگ گیا ہوگا اور اس "ٹچ" نے یکے بعد دیگرے چاروں سائیکلوں کو "لم لیٹ" کر دیا۔

بادی النظر میں تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہاں سے کسی قسم کی کوئی شے چوری نہیں ہوئی تاہم میں نے سرسری لہجے میں یوسف سے کہا۔

"اچھی طرح چیک کر لو بھئی، چور نے تمہاری دکان کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کھڑکی کی جانب قدم بڑھا

دیے جیسے یوسف نے آج دن کے خواب میں دیکھا تھا۔
جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے دوران میں، میں نے وہاں کا نقشہ بناتے وقت ان تمام اشیا کا اندراج کیا تھا جو اس وقت دکان کے اندر موجود تھیں۔ تاہم یہ تفصیلی رپورٹ اس وقت میرے پاس نہیں بلکہ تھانے میں میری میز کی دراز میں رکھی تھی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں یہ بھی دیکھا جاسکتا تھا کہ وہاں سے کوئی چیز چوری ہوئی تھی یا نہیں۔

کھڑکی کے اندرونی تنقیدی جائزے کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دکان کے اندر کوئی داخل تو ہوا تھا اور اس داخلے کے لیے اس نے مذکورہ کھڑکی ہی کو وسیلہ بنایا تھا جس کی خاطر اس شخص کو کھڑکی کے ساتھ زور زبردستی کرنا پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں کھڑکی کو چھوڑ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''کیوں بھئی تم نے چوری شدہ مال کا تخمینہ جوڑ لیا؟''

''تھانے دار صاحب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا یہ چکر کیا ہے!'' وہ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا ''چیزیں تو سب موجود ہیں مگر انہیں اِدھر اُدھر بکھرادیا گیا ہے۔''

''وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس سوچ میں گہرا تفکر شامل تھا۔ اپنی جگہ نہ سہی لیکن ہر شے وہاں موجود تھی مگر میں یوں محسوس کررہا تھا جیسے وہاں کوئی تبدیلی واقع ہوچکی ہو۔ کیا؟ یہ ذہن میں واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔ اگر چور کو وہاں سے کچھ چرانا ہی نہیں تھا تو پھر وہ کس مقصد کی خاطر وہاں داخل ہوا تھا اور وہ بھی پچھواڑے والی کھڑکی توڑ کر! اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اللہ کا بندہ محض ایک سرسری ''وزٹ'' کے لیے کھڑکی توڑ کر وہاں گھسا ہوا۔

دکان میں رکھے سامان کی بے ترتیبی اور افراتفری سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے آنے والے کو وہاں کسی خاص شے کی تلاش ہو۔ ایک ایسی دکان جس کا دکان دار چند روز پہلے قتل ہوچکا ہو۔ اس دکان میں رکھے آلات مرمت سائیکلان سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی!

میں انہی خیالات سے گتھم گتھا تھا کہ ذہن میں ایک چمک سی نمودار ہوئی۔ اس چمک میں مجھے ایک خطرناک سوال کی جھلک دکھائی دی...... کہیں یہ متوقع اجنبی چور بلاواسطہ یا بالواسطہ کریم مستری کے قتل میں ملوث تو نہیں؟

یہ ایک نہایت ہی اہم اور اچھوتا خیال تھا۔ اگر وہ شخص واقعی کسی بھی حوالے سے کریم مستری کے قتل میں ملوث تھا تو پھر وہ وہاں اپنے جرم کے کسی اہم ثبوت کو مٹانے آیا تھا۔ اس کا یہ ''عمل'' کسی بھی نوعیت کا ہوسکتا تھا۔ ممکن ہے وہ دکان میں سے کوئی ایسی شے تلاش کرکے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہو جو اس کے جرم کی جانب اشارہ کرتی ہو۔ میرے ذہن میں صورتحال واضح نہیں تھی تاہم میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور وہ یہ کہ کھڑکی توڑ کر دکان کے اندر گھسنے والا شخص ''کریم مرڈر کیس'' میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا!

عابدہ گہری نظر سے مجھے سوچتے ہوئے دیکھ رہی تھی بولی۔ ''تھانے دار جی! لعنت بھیجیں اس چور پر۔ اللہ کا شکر ہے ہماری کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔'' پھر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''یوسف پتر! تم اس سارے سامان کو ٹھیک ٹھاک کرکے رکھ دو۔ کل سے تمہیں دکان کھولنا ہے۔ کب تک گھر میں گم صم پڑے رہو گے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے اجازت طلب نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں پہلے ہی اسی ارادے سے ادھر آیا تھا کہ آج اس دکان پر پڑا ہوا سرکاری تالا کھول دوں گا تاکہ یوسف رزق روزگار کے معاملات کو جاری رکھ سکے لہٰذا میں نے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ کیا اور دکان کے ایک کونے میں کھڑا یوسف کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے اشارے پر ہمارے ساتھ آنے والا کانسٹیبل بھی اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

میں نے یوسف سے تاکیدی انداز میں کہا ''دکان بند کرنے سے پہلے کھڑکی کی مرمت ضرور کروالینا۔ اس کی کنڈی ہی بدلواڈالو تو اچھا ہے۔ کھڑکی پر ایسی کنڈی لگواؤ جس میں اندر سے تالا بھی لگایا جاسکتا ہو۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا ''میں ذرا یہ سامان سیٹ کرلوں پھر بڑھئی کو بلا کر لاتا ہوں اور دکان سے اس کھڑکی کے لیے ایک چھوٹا سا تالا بھی خرید لاتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ کام میں مصروف ہوگیا۔ میں بڑی دلچسپی سے انہیں کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ عابدہ نے مجھے مخاطب کرلیا۔

''تھانے دار جی! آپ نے بتایا ہے فاروق واپس آگیا ہے اور آپ کی تحویل میں ہے۔ آپ اسے میرے حوالے کب کریں گے؟''

''حوالے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بعد میں فیصلہ ہوگا۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم ماں بیٹا تھانے آجاؤ۔ پھر بات کرتے ہیں۔''

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی ''میرا بیٹا خیریت سے تو ہے نا جی؟''

''وہ بالکل خیریت سے ہے اور میری حفاظت میں ہے۔''
''پھر آپ اسے میرے حوالے کیوں نہیں کر سکتے؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔
میں نے کہا'' ہے ایک چھوٹی سی پیچیدگی۔ اس پر بھی تھانے چل کر ہی بات ہوگی۔''
وہ ماں تھی اس لیے اسے قرار نہیں پڑ رہا تھا'' وہ کہاں چلا گیا تھا؟''
''وہ جہاں بھی گیا تھا اب واپس آ گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' تمہارے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے۔''
وہ خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ میں فی الحال اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس دوران میں یوسف اور کانسٹیبل دکان کی ''سیٹنگ'' سے فارغ ہو گئے تھے۔ میں نے یوسف کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں بھئی! اچھی طرح دیکھ بھال لیا۔ تمہاری دکان کی کوئی شے گئی تو نہیں؟''
''نہیں جی ہر چیز موجود ہے۔'' اس نے دکان میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔
''اور کسی چیز کا اضافہ بھی نہیں ہوا؟'' میں نے سرسری انداز میں سوال کیا۔
''جی!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' میرا مطلب ہے اگر چور یہاں سے کچھ لے کر نہیں گیا تو کیا کچھ دے کر بھی نہیں گیا؟''
یوسف کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے' جزبز ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ عابدہ نے جلدی سے کہا'' یہ اتنا بڑا انعام تو دے کر گیا ہے وہ!'' اس کا اشارہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی جانب تھا۔
غربت اور مفلسی میں اگر ایک پیسے کا نقصان بھی ہو جائے تو وہ ایک لاکھ سے کم محسوس نہیں ہوتا۔ میں عابدہ اور اس کے گھر کی حالت زار سے بخوبی آگاہ تھا اس لیے اس کے احساسات کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔
میں نے پریشان اور نادان صورت یوسف کا کندھا تھپتھپایا اور نہایت ہی تسلی بخش لہجے میں کہا'' زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کل سے جم کر دکان پر بیٹھو۔ میں فاروق کو بھی سمجھا دوں گا، وہ تمہارا ہاتھ بٹائے۔ دونوں بھائی کندھے سے کندھا جوڑ کر معاشی عفریت کا مقابلہ کرو گے تو تمہارے دن پھر جائیں گے۔ اب تم دونوں ہی اس گھر کے بڑے ہو۔ چھوٹے تو بہن بھائیوں کی نظریں تمہی دونوں پر لگی ہوئی ہیں۔''
''آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا' فاروق کہاں ہے؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔
''بتا دوں گا...... بتا دوں گا۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا'' تم یہاں سے فارغ ہو کر میرے پاس تھانے آ جاؤ۔ میں فاروق سے تم دونوں ماں بیٹے کی ملاقات کروا دوں گا۔''
''تت...... تو کیا وہ تھانے میں بند ہے؟''
''بس تھانے میں ہے۔'' میں نے کہا'' بند اور کھلے کے چکر کو فی الحال بھول جاؤ۔''
''فاروق تھانے میں ہے تو اس کا مطلب ہے اس نے کوئی جرم وغیرہ کیا ہے۔''
''ہاں ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔
اس کے بعد یوسف نے کوئی سوال نہیں کیا۔ عابدہ بھی ہماری اس گفتگو کو سن رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھ لیا'' تھانے دار جی! یہ تو بتا دیں آخر میرے بیٹے نے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو آپ نے اسے تھانے میں بند کر رکھا ہے؟''
''میں نے کہا نا' تھانے میں تفصیلی بات ہوگی۔'' اچانک میرا انداز تنبیہی ہو گیا۔
عابدہ خاموش ہوگئی۔ میرے لہجے کی قطعیت نے اسے متاثر کیا تھا۔
میں کانسٹیبل کے ساتھ دکان سے نکل کر تھانے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

بعض سپر ہٹ اور قبول خاص و عوام فلموں کے بارے میں فلاں ''کھڑکی توڑ'' ہفتہ کی اصطلاح تو سننے میں آئی تھی لیکن مقتول کریم مستری کی دکان میں جو'' کھڑکی توڑ'' پروگرام پیش کیا گیا تھا اس کے حوالے سے سوچ سوچ کر میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا اسے ایک غیر اہم واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ کھڑکی توڑ شخص نظر انداز کرنے کے لیے نہیں تھا۔
میں تھانے میں بیٹھا اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مجھے اس دکان میں جو بھی غیر معمولی محسوس ہوا تھا اسے چیک کرنے کے لیے میں نے جائے وقوعہ کی رپورٹ یعنی مشیر نامہ کھول کر سامنے رکھ لیا تھا۔ میرا ذہن بار بار ایک ہی اشارہ دے رہا تھا کہ کھڑکی توڑ نا معلوم چور کا کوئی نہ کوئی تعلق کریم کے قتل سے ضرور ہے اور وہ اپنے جرم کی پردہ پوشی

کے لیے ہی دکان میں گھسا تھا۔ وہ دکان میں سے کوئی شے چرا کر بھاگا یا کوئی دیگر کارروائی ڈال کر رخصت ہوا تھا یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ دکان میں موجود اشیا میں نے دیکھی تھیں وہ سب وقوعہ کی رپورٹ میں موجود تھیں پھر گڑبڑ کہاں تھی؟

اس سوال کے بعد ایک تاریک راہ کھلتی تھی جس پر چلتے ہوئے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا' سوچ کو کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر وہ نامعلوم چور معلوم ہو کر میرے ہتھے چڑھ جاتا تو مجھے یقین تھا' میں مستری کریم کے قاتل تک ضرور پہنچ سکتا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں میں کھوجی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ مبینہ نامعلوم چور کھڑکی کے راستے دکان میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے کوئی کارروائی کی اور پھر کھڑکی کے راستے ہی فرار ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا دکان کے اندر اور پچھواڑے میں اس کا کھرا موجود ہوگا۔ اگر کھوجی کھرا پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو چور تک رسائی ممکن ہو جاتی۔

میں نے کھوجی کرم دین کی جانب ایک بندہ دوڑایا لیکن پتا چلا کہ وہ اس روز قصبے میں موجود نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں سے معلوم ہوا وہ رات کو واپس آجائے گا لہٰذا کھرے والا منصوبہ اگلے دن پر ٹل گیا۔

مستری کریم کا دشمن ابھی تک صرف ایک بندہ علی نواز کی صورت سامنے آیا تھا۔ علی نواز کے بارے میں یہ سوچا جاسکتا تھا وہ اپنے بیٹے گلزار کی محبت سے مجبور ہو کر کریم کا کام تمام کر دے لیکن اس سلسلے میں ایک پیچیدگی بھی سامنے آرہی تھی۔ اگر یہ فرض کر لیا جاتا کہ علی نواز ہی مستری کریم کا قاتل ہے اور ہمارا مبینہ چور بھی وہی شخص ہے تو پھر چوری والا واقعہ اس پر فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ اٹھارہ مئی کی صبح سے میری تحویل میں تھا اور اس پر تفتیش جاری تھی جبکہ کھڑکی ٹوٹنے والا واقعہ انیس مئی یعنی آج کا تھا۔ کل رات تک وہ صحیح سلامت تھی۔ اس بات کی تصدیق میں دکان میں یوسف سے کر چکا تھا۔ ان حالات و واقعات سے جو نتیجہ سامنے آتا تھا اس کے مطابق بڑے وثوق سے یہ کہا جاسکتا تھا علی نواز کسی بھی حوالے سے کریم کے قتل میں ملوث ہے یا نہیں اس سے قطع نظر کھڑکی توڑ کر دکان میں گھسنے والا شخص ہرگز وہ نہیں تھا۔

میں لگ بھگ پانچ بجے سہ پہر تھانے پہنچ گیا تھا اور توقع کر رہا تھا کہ آدھے پونے گھنٹے میں یوسف بھی اپنی ماں کے ساتھ میرے پاس آجائے گا لیکن میری توقع غلط ثابت ہوئی اور وہ لوگ ساڑھے سات بجے شام تھانے پہنچے۔

''بھئی تم دونوں کہاں رہ گئے تھے؟'' ان پر نگاہ پڑتے ہی میں نے کہا ''میں کب سے تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ ادھر تمہارا بیٹا فاروق بھی بیٹھا سوکھ رہا ہے۔'' آخری جملہ میں نے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

یوسف بولا ''تھانے دار جی! میں نے لگے ہاتھوں دکان کی صفائی بھی کر ڈالی ہے۔ کافی دنوں سے وہ بند تھی۔ پھر میں گھر چلا گیا اور اب اچھی طرح نہا دھو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ اماں کو میں نے آپ کے جانے کے بعد گھر بھیج دیا تھا۔''

یوسف کے وضاحتی جواب نے مجھے اچھا خاصا مایوس کر دیا۔ دکان کی صفائی ستھرائی کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ اب وہاں سے کسی قسم کا کھرا نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ بہرحال اب اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کھرے والا پروگرام دکان کے پچھواڑے سے شروع کرنا مجبوری تھی۔

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات میں فوری تبدیلی لاتے ہوئے کہا ''چلو کوئی بات نہیں۔ کھڑکی وغیرہ کی مرمت تو ٹھیک طرح سے کروالی ہے نا تم نے؟''

''جی...... جی ہاں......'' اس نے جواب دیا۔

عابدہ میرے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی ''تھانے دار جی! آپ نے تو کہا تھا فاروق آپ کی تحویل میں ہے مگر وہ تو مجھے کہیں نظر نہیں آرہا!''

میں ایک ماں کی بے قراری اور تڑپ کو بڑی گہرائی سے محسوس کر رہا تھا لیکن فرض کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے سبب فوری طور پر فاروق کو ان کے حوالے نہیں کر سکا تھا۔ وہاں البتہ چہرہ نمائی اور مختصر ملاقات کی گنجائش موجود تھی۔ فاروق کی جان بخشی تو اسی وقت ممکن تھی جب لاہور سے واپس آنے والے کانسٹیبل اس کے بیان کی تصدیق کر دیتا۔

میں نے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم کیا سمجھتی ہو میری تحویل اسی کمرے تک محدود ہے۔ اگر فاروق اس کمرے میں موجود نہیں تو پھر میری تحویل میں بھی نہیں؟'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فاروق سے میں ابھی تم دونوں کی ملاقات کروا دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں تم کو اس کی کہانی ضرور سناؤں گا۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں فاروق کے گھر سے فرار ہونے' لاہور پہنچنے' وہاں مزدوری کرنے اور بالآخر بازار حسن کے ایک کوٹھے سے گرفتار ہونے کے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ میں خاموش ہوا تو عابدہ جھٹ سے بولی۔

"جو بیت گیا اس پر مٹی ڈالیں جی۔ فاروق زندہ سلامت واپس آ گیا ہے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں۔"

"فی الحال ایسا نہیں ہو سکے گا۔" میں نے قطعیت سے کہا "میں نے اپنا ایک بندہ لاہور بھیجا ہوا ہے وہ واپس آ جائے تو پھر میں فیصلہ کروں گا فاروق کو چھوڑنا ہے یا نہیں۔"

وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی "یہ تو آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ آپ کا جو بندہ لاہور گیا ہے اس کا فاروق سے کیا تعلق؟"

"تعلق بہت گہرا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "وہ بندہ فاروق کے بیان کی تصدیق کے لیے لاہور گیا ہے۔"

"پتا نہیں یہ کیا نیا چکر چل پڑا ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

"یوسف بولا "تھانے دار جی! ادھر دکان میں بھی میں نے یہ سوال کیا اور یہاں بھی میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نے فاروق کو کسی سنگین الزام میں بند رکھا ہے؟"

"الزام تو سنگین ہی ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "بس تصدیق یا تردید کا انتظار ہے۔"

"آخر اس نے کیا کیا ہے؟" وہ جھنجلاہٹ بھری آواز میں بولا۔

"مجھے شک ہے فاروق نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔"

"ہائے میں مر گئی......" عابدہ سینہ تھامتے ہوئے بولی۔

یوسف کی زبان سے بے ساختہ برآمد ہوا "نن...... نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ فاروق اپنے باپ سے شدید نفرت کرتا تھا۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "نفرت اپنی جگہ لیکن فاروق نے ابا کو قتل نہیں کیا۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا "تمہارے انداز سے تو ظاہر ہوتا ہے تم اصل قاتل سے واقف ہو!"

"یہ بات نہیں۔" وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"وہ...... وہ دراصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ فاروق تو چار مئی کو گھر سے نکل گیا تھا اور اب ملا ہے۔" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا "ابا کا قتل پندرہ مئی کو ہوا ہے۔ اس دن فاروق قصبے میں موجود ہی نہیں تھا تو پھر......"

"فاروق کا بھی یہی موقف ہے۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "اسی سلسلے میں میں نے ایک تجربہ کار بندہ لاہور دوڑایا ہے تاکہ فاروق کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔"

"اوہ۔" یوسف نے ایک گہری سانس خارج کی اور ماتھے پر نمودار ہونے والے پسینے کو آستین کی مدد سے صاف کرنے لگا۔

عابدہ بولی "کچھ بھی ہے آپ فاروق کو مجھ سے ملوائیں تو سہی۔ میں اس سے خود پوچھوں گی کہ......"

عابدہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ لاہور جانے والا پولیس اہلکار واپس آ گیا ہے۔ میں نے مذکورہ کانسٹیبل کو اپنے کمرے ہی میں بلا لیا۔

آئندہ دس منٹ میں اس نے فاروق کے بیان کی تصدیق کر دی۔

یوسف اور عابدہ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ فاروق اپنے باپ کے قتل کے الزام سے "صاف" ثابت ہو گیا ہے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

میں نے فاروق کے سلسلے میں قانونی کاغذی کارروائی مکمل کی اور فاروق کو چند ہدایات کرنے کے بعد ان لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

رات ساڑھے نو کے قریب کھوجی کرم دین میرے پاس تھانے آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا "ملک صاحب! مجھے گھر والوں نے بتایا ہے آپ کو کسی کام کے سلسلے میں میری ضرورت پڑ گئی ہے؟"

"تمہیں بالکل درست بتایا گیا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا پھر مختصر الفاظ میں اپنا مقصد دہرانے کے بعد آخر میں کہا "دکان کے اندر کی صفائی کی جا چکی ہے اس لیے وہاں سے کھرا اٹھانا ممکن نہیں ہو سکے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ پرسوچ مگر باعتماد انداز میں بولا "میں دکان کے پچھواڑے سے کام شروع کروں گا۔ انشاء اللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "کھڑکی توڑ کر دکان کے اندر گھسنے والا واقعہ کب کا ہے؟"

"گزشتہ رات یا پھر آج علی الصباح یہ واردات عمل میں آئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے زیادہ وقت نہیں گزرا۔" اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی "مجھے اپنے کام کے لیے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''بولو کیا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا ''آپ نے بتایا ہے کہ آج سہ پہر میں آپ تفتیش کے سلسلے میں اس طرف گئے تھے۔ دکان کے اندر اور پچھواڑے میں آپ نے کچھ وقت گزارا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں آپ کتنے افراد تھے اور اس کے ساتھ ہی ان تمام افراد کے پاؤں بھی مجھے دیکھنا ہوں گے تاکہ چور کا کھرا آپ لوگوں کے کھرے سے الگ پہچانا جاسکے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ہم کل چار افراد تھے۔ ایک میں اور کانسٹیبل' دوسرے یوسف اور اس کی ماں عابدہ۔ کانسٹیبل اور میں یہاں تھانے میں موجود ہیں۔ تم ہمارے کھرے کا نمونہ لے لو۔ یوسف اور اس کی ماں کے پاؤں کو صبح چیک کرلینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

میں نے اس کی آسانی کے لیے بتادیا کہ ہم نے دکان کے پچھواڑے جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا تھا تاکہ اسے اس سلسلے میں زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے۔ وہ معنیٰ خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کام میں جتا رہا۔ جب وہ اس تکنیکی مشاہدے اور تجزیے سے فارغ ہوا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کرم دین! تم اپنے کام کا آغاز کب کرو گے؟''

''صبح سے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''اس وقت رات کے اندھیرے میں تو ممکن نہیں البتہ کل جیسے ہی اجالا کھلے گا میں دکان کے پچھواڑے سے کھرا اٹھانے کی مہم شروع کردوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا ''اور جیسے ہی کوئی اہم بات سامنے آئے مجھے اطلاع کردینا۔''

''ظاہر ہے جی آپ کو نہیں بتاؤں گا اور کس کو بتاؤں گا۔'' وہ پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد کرم دین مجھے سلام کر کے تھانے سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا بات تھی کہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میرے ساتھ ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد عشا کی نماز ادا کرتا اور تھوڑی دیر بعد سونے کے لیے بستر پر لیٹ جاتا۔ آج رات بھی میں نے یہی عمل دہرایا تھا مگر ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور...... نیند کی اس دوری کا سبب تھا وہ نامعلوم نامعقول چور جس نے مقتول مستری کریم کی دکان میں کھڑکی کے راستے رسائی حاصل کی تھی۔ میں ہر صورت میں اس شخص تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اس کیس کا ایک اہم کردار تھا۔

مذکورہ چور کریم کا قاتل ہوسکتا تھا یا پھر اس کے توسط سے میں قاتل تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔ بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال سر اٹھا رہا تھا...... یہ کون شخص ہے...... مجھے کہاں ملے گا؟

انہی سوالیہ خیالات سے الجھتے ہوئے میں پتا نہیں کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔

رات کو دیر سے سویا تھا لہٰذا صبح معمول سے کچھ دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت جانے ہی والا تھا چنانچہ میں نے جلدی جلدی وضو کر کے پہلے نماز ادا کی پھر ناشتے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران میں اجنبی چور اس کی پراسرار ''چوری'' والا قصہ ایک مرتبہ پھر کسی فلم کے مانند میرے ذہن میں چلنے لگا تھا۔

ناشتا اختتام پر تھا کہ میرے ذہن میں اچانک تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ انسان اگر کسی ایک نقطے پر توجہ مرکوز کر کے اس کے بارے میں مسلسل سوچنا شروع کردے تو اس کا ذہن اس نقطے کو ایک وسیع میدان میں بدل دیتا ہے' اس کی نگاہ کے سامنے نئی راہیں اور شاہراہیں کھل جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مستری کریم کی دکان اور نامعلوم پراسرار چور کے حوالے سے میرے ذہن نے مجھے ایک انوکھی راہ سجھائی تھی۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور کوارٹر سے نکل کر تھانے میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا پھر اپنی میز کی دراز میں سے وقوعہ کی کارروائی سے متعلق رپورٹ کو نکال کر اضطراری انداز میں اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

مجھے ایک خاص شے کی تلاش تھی۔ میں اس رپورٹ میں سے ایک ایسا نکتہ ڈھونڈنا چاہتا تھا جو میرے ذہن میں ہونے والے جھماکے کی تشفی کرسکے گا...... میں اپنی کوشش میں ناکام ہوگیا اور یہ ناکامی درحقیقت میری کامیابی تھی۔

میرے اعصاب تن گئے اور پورے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں یوسف کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ مستری کریم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد میں نے یوسف کے ساتھ پیدل ہی اس کے گھر کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔ راستے میں' میں اس سے مختلف سوالات بھی کرتا رہا تھا اور ایسے ہی میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا ''تھانے دار صاحب! جب اماں کی زبانی مجھے پتا چلا کہ ابا گھر نہیں پہنچا تو میں اسے دیکھنے دکان کی

طرف چلا گیا۔ میں نے دکان کے اندر ابا کو بے ڈھنگے انداز میں پڑے دیکھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے ماچس جلائی تو اس ناکافی روشنی میں، میں نے ابا کی گردن میں بندھی ہوئی سائیکل کی ٹیوب دیکھ لی۔ میں تیلی پر تیلی جلاتا گیا اور پھر......''

یوسف کے کہے ہوئے یہ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونج رہے تھے مگر مشیر نامہ ان الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرتے وقت میں نے معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی شے کا بھی اندراج کیا تھا پھر ماچس کی جلی ہوئی متعدد تیلیاں کہاں چلی گئیں؟ رپورٹ میں ان کا ذکر کیوں نہیں تھا؟ اگر میں نے ان کا اندراج نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب تھا وہ وہاں موجود نہیں تھیں لیکن کل جب میں دوبارہ اس دکان میں داخل ہوا تو فرش پر مجھے جلی اور ادھ جلی بے شمار تیلیاں دکھائی دی تھیں۔

کھڑکی توڑ کر دکان میں گھسنے کا راز عیاں ہو گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا تیلیاں پھینکنے کے مقصد سے دکان میں داخل ہوا تھا تاکہ کہانی کی کمزوری کو طاقت کا انجیکشن لگا کر دور کیا جا سکے اور وہ شخص...... یوسف بھی ہو سکتا تھا۔

تیلی پر تیلی جلانے والی کہانی یوسف ہی نے مجھے سنائی تھی۔ وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے دکان پر سرکاری تالا ڈال دیا تھا۔ رپورٹ میں تیلیوں کا ذکر نہیں تھا۔ ازاں بعد مذکورہ تیلیوں کو دکان کے اندر پہنچانے کے لیے دو ہی راستے استعمال کیے جا سکتے تھے۔ نمبر ایک دکان کا دروازہ۔ نمبر دو پچھواڑے والی کھڑکی۔ دروازے پر سرکاری تالا موجود تھا لہٰذا اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کھڑکی والا وسیلہ اختیار کیا گیا...... اور مجھے اس جانب متوجہ کرنے کے لیے ''خواب'' کا سہارا لیا گیا۔

حالات و واقعات سراسر یوسف کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور یوسف کو اس ڈرامے کی ضرورت اسی صورت پیش آ سکتی تھی جب وہ کسی جرم میں ملوث ہو۔ تو کیا کریم کو اس کے بیٹے یوسف نے ہی قتل کیا تھا؟

اس سوال نے میرے ذہن میں ہلچل سی مچا دی اور میں نے فی الفور اے ایس آئی جلال دین کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جلال دین وقوعہ کی کارروائی کے دوران میرے ساتھ ہی تھا۔ میں کوئی عملی قدم اٹھانے سے قبل ایک چھوٹی سی بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

اے ایس آئی میرے کمرے میں آیا تو میں نے اس سے پوچھا ''جلال دین! تمہارا حافظہ کیسا ہے؟''

''الحمد اللہ! ملک صاحب! میرا حافظہ اور ہاضمہ دونوں فرسٹ کلاس ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''کیا مسئلہ ہے آپ چہرے سے کافی الجھے ہوئے نظر آ رہے ہیں؟''

''الجھا ہوا تھا' اب نہیں ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''اپنی یادداشت پر زور دو اور اس رات کو ذہن میں لانے کی کوشش کرو جب ہم مستری کریم کی دکان پر وقوعہ کی کارروائی میں معروف تھے۔''

''جی ملک صاحب! وہ منظر میرے ذہن میں تازہ ہے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

میں نے کہا ''ذرا سوچ کر بتاؤ دکان کے فرش پر اس رات تمہیں جلی ہوئی ماچس کی تیلیاں بھی نظر آئی تھیں؟''

اس نے ایک لمحہ سوچا اور پریقین انداز میں جواب دیا ''نہیں ملک صاحب! دکان کے فرش پر ایک بھی تیلی پڑی ہوئی نہیں تھی۔ میں تو لاری اڈے سے ایک ویگن پکڑ لایا تھا جس کی ہیڈ لائٹس نے دکان کے اندر روشنی بھر دی تھی۔ اگر دکان کے فرش پر ماچس کی تیلیاں موجود ہوتیں تو وہ نگاہوں میں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''جناب! آپ وقوعہ کی رپورٹ دیکھ لیں نا مجھے یقین ہے اس رپورٹ میں کہیں بھی ماچس کی تیلیوں کا ذکر نہیں ہو گا۔''

میں نے میز پر رکھی مذکورہ رپورٹ کو جلال دین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''تمہارا یقین بجا ہے۔''

وہ میرے ہاتھ سے رپورٹ لینے کے بعد سنسنی خیز انداز میں بولا ''ملک صاحب! لگتا ہے آپ مستری کریم کے قاتل تک پہنچ گئے ہیں؟''

''تمہارا یہ اندازہ کسی حد تک درست ہے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''مجھے ایک واضح اشارہ ملا ہے تم متوقع قاتل کو گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ گے۔''

''حکم ملک صاحب!'' وہ رپورٹ کو ایک طرف رکھ کر پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر اس پر واضح کیا۔ اس نے میرے اندازے کی تائید کی۔ ٹھیک نو بجے اے ایس آئی جلال دین دو کانسٹیبلو کے ساتھ یوسف کو گرفتار کرنے تھانے سے روانہ ہو گیا۔

ساڑھے نو بجے ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ کھوجی کرم دین مجھ سے ملنا چاہتا تھا میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔

کرم دین کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا بات ہے کرم دین! تم یہاں کیسے نظر آ رہے ہو تمہیں تو آج اہم کام کرنا تھا؟''

''کام ختم کر کے ہی تو آپ کی طرف آیا ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''بس آپ کو رپورٹ پیش کرنا باقی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا ''میں چور کے کھوج والے کام کا ذکر کر رہا ہوں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا ''جی ہاں میں بھی کھوج ہی کی رپورٹ دینے آیا ہوں۔ میں نے اس پر اسرار چور کا کھرا نکال لیا ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں اچھل پڑا۔

''مقتول کریم کا بڑا بیٹا یوسف۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

اس کا یہ انکشاف میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا تاہم میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا ''کیا واقعی! تم نے کھرا نکالنے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب! میں نے اس کام میں اپنی عمر گزار دی ہے۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا ''میں نے بڑی باریک بینی سے چیک کیا ہے۔ کھڑکی توڑ کر دکان کے اندر داخل ہونے والا بندہ مستری کریم کے گھر سے نکل کر دکان کے پچھواڑے پہنچا تھا اور اپنا کام کر کے وہ واپس مستری کریم کے گھر ہی میں داخل ہوا تھا......

''ایک منٹ!'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کی بات کاٹی ''تم نے تھوڑی دیر پہلے یوسف کا نام لیا ہے تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ وہ کھرا یوسف کا ہے؟''

''میں نے اس کے پاؤں کے نمونے سے اندازہ لگایا ہے جناب!'' کھوجی کرم دین نے جواب دیا ''رات آپ کے پاس سے جانے کے بعد میں سیدھا یوسف کے گھر پہنچا تھا۔ مجھے علی الصباح کھوج کا کام شروع کرنا تھا۔ آپ کے اور کانسٹیبل کے پاؤں کے نمونے میں حاصل کر چکا تھا۔ عابدہ اور یوسف کے پاؤں کا کام باقی تھا میں نے سوچا یہ کام رات ہی میں نمٹالوں صبح کا کیا بھروسا!''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور کہا ''تم نے بہت اچھا کیا کرم دین!''

وہ بولا ''اب یوسف کو تھانے بلا کر باقی سوال جواب آپ خود کر لیں اور مجھے اجازت دیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا اور امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اسے میری طرف سے انعام ملنے کی توقع تھی۔ پولیس کے لیے کام کرنے والے مخبر' کھوجی اور اس قسم کے دیگر معاون افراد کو کام کی تکمیل پر چھوٹا موٹا انعام ضرور دیا جاتا ہے۔ باقی تھانے داروں کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میں انعام کی یہ رقم اپنی ذاتی جیب سے دیا کرتا تھا۔

میں نے کرم دین کو پانچ روپے دے کر تھانے سے رخصت کر دیا۔ اس زمانے میں پانچ روپے کی بڑی وقعت تھی۔ آج کل کے سات ساڑھے سات سو سمجھ لیں۔

دس بجے کے قریب اے ایس آئی جلال دین خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ خالی ہاتھ ان معنوں میں کہ یوسف اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا البتہ عابدہ اور فاروق اس کے پیچھے پیچھے تھانے پہنچے تھے۔ میں نے آخر الذکر افراد کو برآمدے میں روک کر اے ایس آئی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''ملک صاحب! دکان بند ہے اور وہ بدبخت گھر پر بھی موجود نہیں۔'' اے ایس آئی نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے اسے گرفتاری کی خبر پہلے سے دے دی ہو۔ عابدہ کے مطابق جب آج صبح اس کی آنکھ کھلی تو یوسف غائب ہو چکا تھا۔''

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ یوسف نے اپنی جانب بڑھنے والے خطرے کی بو قبل از وقت سونگھ لی تھی۔ بہرحال تم عابدہ کو اندر بھیجو۔ میں ذرا اس کا انٹرویو کر لوں۔''

یوسف کا اچانک منظر سے غائب ہو جانا اس کے کسی سنگین جرم کی نشاندہی کرتا تھا اور یہ سب کچھ کھوجی کرم دین کی کارکردگی کی وجہ سے ظہور میں آیا تھا۔ کھوجی نے اپنے کام میں بہت زیادہ تیزی کا مظاہرہ کیا اور رات ہی ان ماں بیٹے کے پاؤں کے نمونے لینے ان کے گھر پہنچ گیا۔ ظاہر ہے کھوجی کے عزائم یوسف سے ڈھکے چھپے نہیں رہے ہوں گے۔ وہ سمجھ گیا ہو گا' کھوجی بہ آسانی اس بات کا سراغ لگا لے گا کہ دکان کی عقبی کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہونے والے کا تعلق مقتول مستری کریم کے گھر سے ہے اور کھرا اس بات کی بھی تصدیق کر دے گا کہ وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ یوسف ہی ہے۔ چنانچہ اس سے پیشتر کہ پولیس کے ہاتھ اس تک پہنچتے وہ منظر سے غائب ہو گیا۔

عابدہ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کریم کے قاتل کی حیثیت سے مجھے یوسف کی تلاش ہے لہٰذا وہ میرے کمرے میں پہنچتے ہی واویلا کرنے لگی۔

''تھانے دار جی!'' اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا ''یہ تو میرے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ پہلے آپ نے فاروق پر شبہ کیا اور اب یوسف کو کریم کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔''

خوش خبری

لڑکی نے ایک روز مسرور لہجے میں اپنے منگیتر کو بتایا ''تمہارے لیے یقیناً یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ جب ہماری شادی ہوگی تو تمہارے گھر میں ایک ایسی عورت آجائے گی جو کھانے پکانے میں بے حد ماہر ہے۔''

''اچھا؟'' منگیتر نے خوشگوار حیرت سے کہا ''مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم کھانے پکانے میں ماہر ہو۔''

''میں اپنی بات نہیں کر رہی۔'' لڑکی بولی ''شادی کے بعد میری امی ہمارے ساتھ ہی رہنے کے لیے آجائیں گی۔''

''کوئی زیادتی نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''کسی بھی کیس کی تفتیش میں ان سب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ شوہر کے قتل کے بعد اب تمہیں بڑے بیٹے کی جدائی کو بھی سہنا پڑے گا۔''

''یوسف بے گناہ ہے تھانے دار صاحب!'' اس نے فریادی لہجے میں کہا ''وہ بھلا اپنے باپ کو قتل کیوں کرے گا۔ وہ تو کریم کا دایاں بازو تھا۔ آپ کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

میں ایک دکھیاری ماں کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن پیشہ ورانہ فرائض سے مجبور تھا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا ''یوسف نے اپنے باپ کو کیوں قتل کیا یہ تو وہ خود ہی بتائے گا۔ تم فی الحال یہ بتاؤ کہ وہ کہاں غائب ہوا ہے؟''

''میں نہیں جانتی...... کچھ نہیں جانتی۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولی ''مجھے بتا کر گیا ہوتا تو مجھے پتا بھی ہوتا۔ میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں وہ بے گناہ ہے اور......''

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''وہ بے گناہ نہیں۔ اس کا جرم میرے ریکارڈ پر آچکا ہے۔ میں اس کی دروغ گوئی اور ڈرامے بازی سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہوں۔ اس نے میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے خواب والی کہانی تراشی اور اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے ایک ایسی چال چلی جسے میں بے نقاب کر چکا ہوں۔''

اس کے بعد مختصر الفاظ میں، میں نے عابدہ کو کھوجی کرم دین کی کارکردگی اور تیلیوں والے قصے سے آگاہ کیا جس سے یوسف کا کھلا جھوٹ اور جرم ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک ماں تھی اس لیے اسے بیٹے کے کرتوت کا یقین نہ آیا اور مسلسل ایک ہی جملے کی گردان کرتی چلی گئی۔

''میرا بیٹا بے قصور ہے۔ وہ قتل جیسا سنگین جرم نہیں کر سکتا۔''

میں نے عابدہ کو اپنے کمرے سے رخصت کر کے اے ایس آئی کو اندر بلا لیا۔ عابدہ برآمدے میں جا کر فاروق کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے تیور سے یہی ظاہر ہوتا تھا فی الحال اس کا گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے اے ایس آئی کے ساتھ ہنگامی میٹنگ کر کے یوسف کی تلاش کا منصوبہ تیار کر لیا۔ تین تین اہلکاروں پر مشتمل چار پولیس پارٹیاں ترتیب دی گئیں تین پارٹیاں آس پاس کے قصبہ جات اور ایک پارٹی کو لاہور روانہ کر دیا۔ لاہور میں یوسف کا پھوپھا فضل محمود رہتا تھا۔ ادھر سمن آباد میں اس کی پھل فروٹ کی دکان تھی۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ چپ چھپاتے لاہور کی طرف نکل گیا ہو۔

اکیس مئی کی شام کو چھ بجے یوسف تھانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ ایک پولیس پارٹی جس کی باگ ڈور اے ایس آئی جلال دین کے ہاتھ میں تھی نے اسے ''فیروز والی'' نامی قصبے سے گرفتار کیا تھا۔ فیروز والی ہمارے قصبے سے آٹھ دس میل کی دوری پر تھا۔

وہ میرے کڑے سوالات کے حلقے میں بند ہوا تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا جو میں اسے خطرناک نوعیت کی تفتیش سے گزارتا۔ میں نے علیحدگی میں لے جا کر حوالدار کو سمجھا دیا کہ ہاتھ ہلکا اور زبان بھاری رکھتے ہوئے اس سے اقبال جرم کرانے کی کوشش کرو۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ حوالدار شیر علی کے خطرناک دبکوں سے متاثر ہو کر یوسف نے اپنے باپ کے قتل کا اقرار کر لیا۔ اس نے یہ جرم حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا۔ جس میں اس کے مجروح جذبات کا بھی غالب عمل دخل تھا۔

جرم کسی مجبوری کے تحت کیا جائے یا ہنسی خوشی، وہ جرم ہی کہلاتا ہے اور قانون کی کتابوں میں ہر جرم کے لیے ایک سزا بھی مقرر ہے جو جرم ثابت ہونے پر سنا دی جاتی ہے۔

یوسف کا اقبالی بیان کئی صفحات پر مشتمل تھا۔ میں اس بیان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ اس کیس کا پس منظر واضح ہو سکے۔

یوسف بھی فاروق کی طرح اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا۔

دونوں کی نفرت میں صرف اتنا فرق تھا کہ فاروق اس نفرت کو چھپاتا نہیں تھا جبکہ یوسف اس سنگین اور مہلک جذبے کو دل میں پال رہا تھا۔ اسے ہرگز یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کا باپ اس کی ماں کو عملی ظلم و ستم کا نشانہ بنائے۔ کریم کا اپنی بیوی کو زدوکوب کرنا یوسف کے دل کو خون کر دیتا مگر وہ اپنے مزاج سے مجبور تھا۔ اس نے کبھی بھی باپ کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کی جب کہ اس کا جی تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں پر جبر کرنے والے کا گلا گھونٹ دے۔ کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ فاروق کی طرح وہ بھی کام سے بے پروا ہو جائے لیکن پھر چھوٹے بہن بھائیوں کی صورتیں اس کی نگاہ میں پھرنے لگتیں۔ وہ اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا تو کام کی مقدار بڑھ جاتی۔ اس طرح آمدنی میں بھی اضافہ ہو جاتا جو اس کی ماں، اس کے چھوٹے بہن بھائیوں اور اس کے گھر کی سلامتی کے لیے بہت ضروری تھا۔ یوسف کو اس ضرورت کا شدت سے احساس تھا۔

یوسف میں برداشت کرنے کی صلاحیت موجود تھی لیکن جب پانی سر سے اوپر اٹھنے لگے تو ایسے برداشت کے مالک لوگ بھی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ تین مئی کی رات مقتول کریم اور اس کی بیوی کے درمیان شدید جھگڑا ہوا تھا اور چار مئی کی صبح فاروق گھر سے غائب ہو گیا۔ اس واقعے نے یوسف کو بری طرح متاثر کیا لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا لہٰذا دل کے غبار کے اخراج کے لیے اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ اس دن کے بعد سے کریم نے ہر رات اپنی بیوی کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ دیگر الزامات میں ایک اضافہ یہ بھی ہو گیا کہ فاروق کو عابدہ کے لاڈ پیار نے بگاڑا تھا اس لیے وہ سرکش اور ضدی ہو گیا اور بالآخر باپ کے مقابلے پر اتر آیا۔ تین مئی کی رات ماں کو بچانے کے لیے فاروق نے باپ سے ہاتھا پائی کی تھی۔

عابدہ ہر رات پٹتی اور برداشت کرتی رہی لیکن چودہ مئی کی رات یوسف کی برداشت جواب دے گئی۔ اس رات کریم نے عابدہ کو ایسے وحشیانہ انداز میں زدوکوب کیا کہ یوسف کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس مسئلے کا ضرور کوئی نہ کوئی حل نکالے گا۔

دوسرے روز یعنی پندرہ مئی کو اس کا کام میں دل نہیں لگا۔ وہ پورا دن دکان میں باپ کے ساتھ مصروف رہا مگر اس کے ذہن میں خوفناک انتقام کی فلم چلتی رہی اور پھر شام سے پہلے وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے مسئلے کا حل تلاش کر لیا تھا۔

اور...... اس شام جب وہ اپنی دکان سے رخصت ہوا تو اپنے فیصلے پر عمل کر چکا تھا!

''ایسے شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا' چاہے وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔'' اپنے بیان کے اختتام پر اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا'' یہ سنگین قدم اٹھاتے ہوئے تمہیں اپنے انجام کی بھی کوئی فکر تھی؟''

''میرا خیال تھا میں قانون کی گرفت میں نہیں آؤں گا۔'' وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا'' لیکن پہلے ہی قدم پر مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ اگر میں نے بار بار ماچس جلانے کا ذکر کرنا ہی تھا تو مجھے دکان میں جلی ہوئی تیلیاں بھی چھوڑ کر آنا چاہیے تھا۔''

''دوسری غلطی تم سے یہ ہوئی کہ مذکورہ تیلیاں دکان کے اندر پہنچانے کے لیے کھڑکی توڑ کر چور والی کہانی چلا دی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا'' حالانکہ اگر تم یہ کام نہ بھی کرتے تو......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتا تو شاید قانون کی گرفت میں بھی نہ آتا۔ جب تک اس نے جعلی خواب اور نقلی چور والا ڈراما نہیں رچایا تھا میں اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے نامکمل جملے کے جواب میں جلدی سے بولا۔

''مجھے یہ ڈر تھا کہ جب آپ سرکاری تالا کھول کر دکان میرے حوالے کریں گے تو کہیں میری چوری پکڑی نہ جائے۔ دکان کے فرش پر جلی ہوئی تیلیاں نہ پائی گئیں تو آپ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔'' پھر وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا'' مجھ سے غلطی ہوئی...... سخت غلطی ہوئی۔''

کریم ایک ٹیڑھی اینٹ تھا۔ ٹیڑھی اینٹ پر جس عمارت کی بنیاد رکھی جائے وہ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے اور اس کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جو کریم کا ہوا۔ جس طرح ایک ٹیڑھی اینٹ پوری عمارت کی غرقابی کا باعث بنتی ہے بالکل اسی طرح کریم اپنے خاندان کی تباہی و بربادی کا سبب بن گیا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' برخوردار! ذہین سے ذہین مجرم بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ بس اس غلطی کو پکڑنے کی بات ہوتی ہے۔ اس کے بعد مجرم خود بہ خود پکڑا جاتا ہے...... تم تو ایک اناڑی اور نوآموز مجرم ہو۔''

اس نے ندامت آمیز انداز میں گردن جھکالی۔

(تحریر: حسام بٹ)